اقبال اور قرآن

مرتب

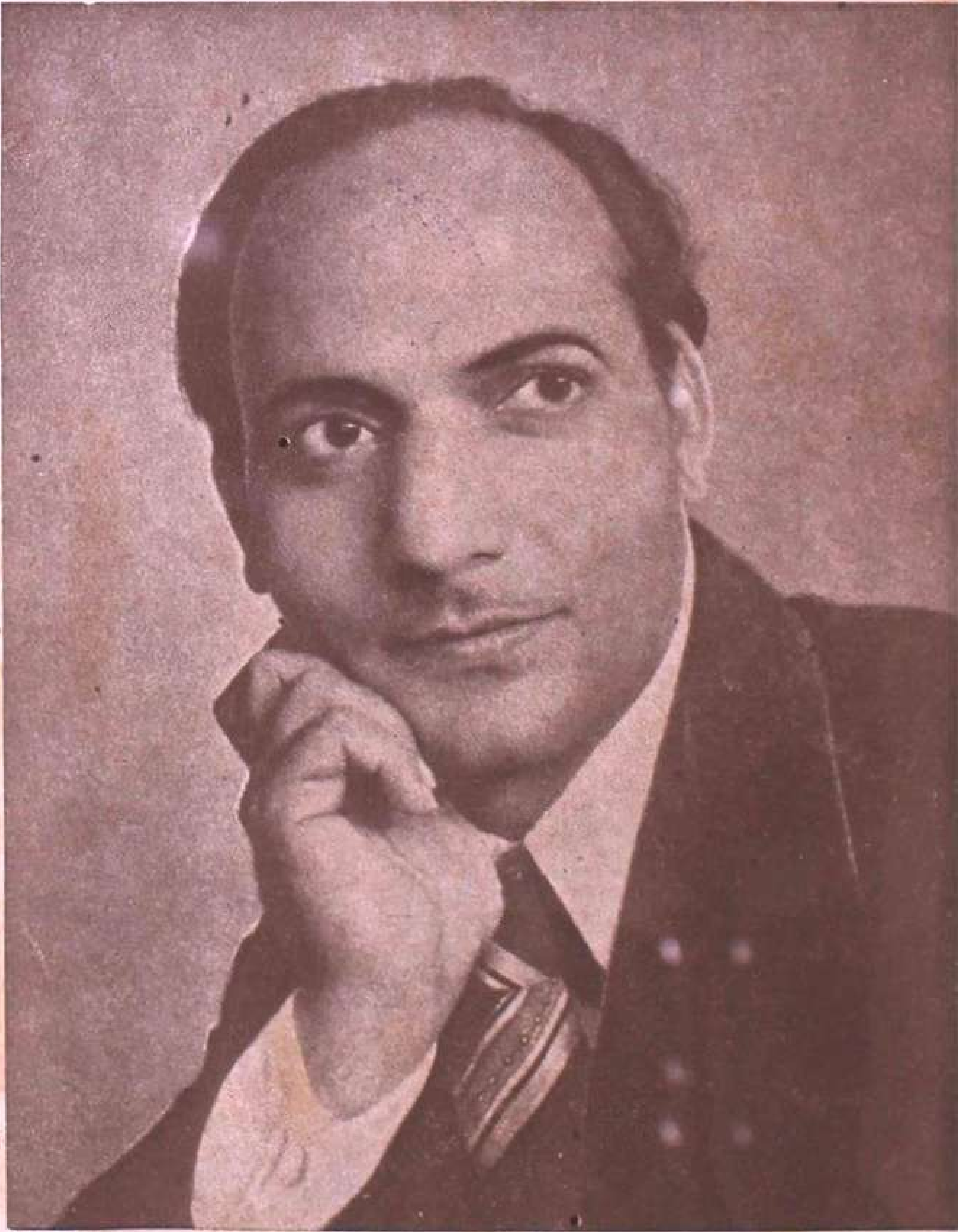
ڈاکٹر عارف بٹالوی

بار اوّل جون سنہ ۱۹۵۰ء

ہدیہ فی نقش پانچ روپئے

کتاب لمیٹڈ

رابسن روڈ کراچی



ڈاکٹر عارف بٹالوی

رُوحِ انتساب

حکیم العصر حضرت علامہ اقبالؒ کے نام

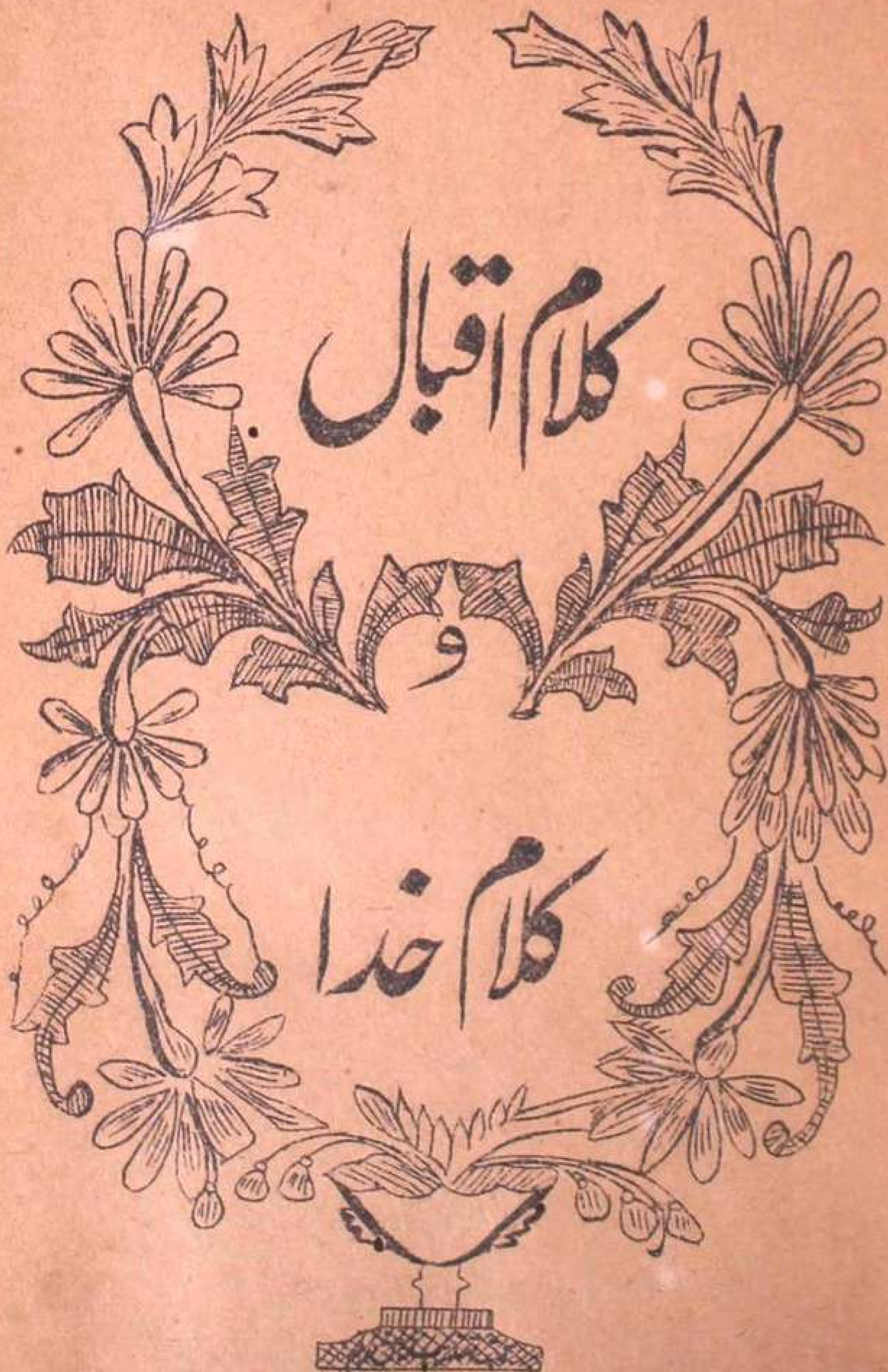
جس کی چیز اسی کی نذر !

عقیدت مند

عارف بٹالوی

موضوعات




کلام اقبال
و
کلام خدا

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

نفی کے ساتھ اثبات ، انکار کے ساتھ اقرار ، بغاوت کے ساتھ اطاعت ، سرکشی کے ساتھ تسلیم ، تخریب کے ساتھ تعمیر ، دُنیا بھر کے نظامہائے حیات سے بغاوت ، اور یہ سرکشی اس لئے نہیں کہ اِسے ضد یا تعصب ہے ، بلکہ اس حقیقت کے اعلان کے لئے کہ انسان ایسا نظام وضع ہی نہیں کر سکتا جو حضرتِ انسان کے عین مطابق ہو - یہ صرف خلاقِ فطرت ہی کر سکتا ہے ۔

اِس حقیقت کا اعلان کہ اس کے سوا کِسی میں شانِ ربوبیت نہیں - اِس کے سِوا کوئی خالق نہیں - اِس کے سِوا کوئی رب نہیں اِس کے سوا کِسی میں کوئی قوت نہیں - رزق کے خزانوں کی چابیاں اِس کے سوا کِسی کے ہاتھ میں نہیں - حکومت اس کے سِوا کسی کو زیبا نہیں - اس کے سوا کِسی کی محکومیت جائز نہیں ۔

جب ایک مردِ مومن اپنے پُورے علم و یقین کے ساتھ ، دل کی گہرائیوں سے اعلان کرتا ہے کہ :-

خودی کا سِرِّ نہاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ
خودی ہے تیغِ فساں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

کیا ہے تونے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زُنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کے آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ



شرک و الٰہ

شانِ ربوبیت کا ارشاد ہے کہ

"جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اس کا حال ایسا سمجھو جیسا آسمان (کی بلندی) سے (زمین کی پستی پر) اچانک گر پڑا۔ جو چیز اس طرح گرے گی اسے یا تو کوئی اُچک لے گا یا ہوا کا جھونکا کسی دُور دراز گوشے میں لے جا کر پھینک دے گا۔"

سچیق (۲۲/۳۱)

جھکنا ہے تو صرف اس ایک کے سامنے جس کے سامنے جھکنے کا حق ہے؛ طاعت ہے تو فقط اس ایک کی، جس کی اطاعت میں شرفِ انسانیت کا راز ہے۔ مظاہرِ فطرت میں سے کسی کے سامنے جھکنا اپنی انسانیت سے انکار کرنا اور اپنے جیسے انسانوں میں سے کسی کے سامنے سرنگوں ہو جانا خودی کی انتہائی ذلت ہے:

ترا وجود سراپا تجلیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

شرک کو اِسی لئے ظلمِ عظیم کہا گیا ہے کہ اس سے بڑھ کر بیجا بات کوئی نہیں ہے۔ یہ اپنی ہستی کا انکار اور اُن کی خدائی کا اقرار ہے جو زیادہ سے زیادہ اپنے جیسے انسان ہیں۔ جس نے شرفِ انسانیت اور خودیٔ بلند جیسی متاعِ عزیز کو یوں دوسروں کی نذر کردیا تو اس کے بعد اور کونسی شئے باقی رہ سکتی ہے جسے بیچ ڈالنے میں اِسے کسی قسم کا تامل ہو سکتا ہے؟ اللہ پر ایمان اور ہر غیر اللہ قوت سے انکار، یہ ہے رازِ زندگی، یہ ہے اصلِ حیات:۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

اِلّا یعنی اقرار (ایمان) اور ایمان وہ جس کا سرچشمہ دل کا یقین اور جس کا مظہر نظامِ حیات ہو۔ نہ وہ جو محض زبان کی جنبش تک محدود ہو کر رہ جائے؛ اور زندگی اس کی عملی تکذیب کررہی ہو، ایسے جسدِ بے روح کی کیا قیمت!

یہ عقل جو مہ و پروین کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جب ثبات پر سرگردانیاں ایمان لے آئیں تو پھر ایک اور جستجو نے پریشان کیا، کہ یہ سب کس کی طرف سے ہے؟ اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، اِس منتہی کی تلاش میں مدتوں دشت پیمائیاں اور صحرا نوردیاں کیں۔ لیکن تنہا ذہنِ انسان اِس منزل کا کہیں سُراغ نہ پا سکا۔ نہ یونان کی درسگاہوں میں، نہ ایران کے آتشکدوں میں، نہ ہندوستان کے یوگ استھانوں میں، نہ نُدما کی خانقاہوں میں۔ جب کہیں وحیِ ربانی کے نغمہ سرمدی کی کوئی آواز کان میں پڑ گئی، اس کی نگاہوں میں شادابی اور پیشانی پر نُور کے آثار چمک اُٹھے۔ لیکن جُوں ہی وہ گم ہوئی پھر اُسی وادیِ حیرت میں کھو گیا۔ یہی ہوتا رہا، تاآنکہ اِن بکھرے ہوئے نغموں کی صدائیں ایک ایسے رباب جاں نواز میں سمٹ کر آگئیں، جس نے اپنے ترنّم لاہوتی کی پُوری دلکشی سے فضائے عالم کو اس نغمۂ جاں فزا سے منور کر دیا۔ لیکن افسوس

کہ آج پھر مسلمان انہی منزلوں سے الگ بھٹک کر غلط راہوں پر چلا جا رہا ہے۔ اور مظاہر کائنات کو اپنا رب تسلیم کرنے میں تامل نہیں کر رہا، حالانکہ یہ سب کچھ اسی کی خاطر چمکتے ہیں۔

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بوقلمونی
وہ چاند یہ تارا ہے وہ پتھر یہ نگیں ہے
دیتی ہے مری چشمِ بصیرت بھی یہ فتویٰ
وہ کوہ یہ دریا ہے وہ گردوں یہ زمیں ہے
حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

تصور، اور کسی بلند و بالا ہستی کا تصور، کسی اپنے سے بڑی ذات کے وجود کا احساس۔ ایسی ذات کا تخیئل جس کی عبودیت اختیار کی جائے، جس کے سامنے جھکا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ احساس فطرتِ انسان کا احساس ہے، تو اس احساس کا پیدا کردہ تصور بھی خالقِ فطرت کا تصور ہونا چاہیئے۔ لیکن جس طرح گوناگوں اسباب واثرات فطرتِ انسانی پر مختلف قسم کے پردے ڈال کر اسے کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں اسی طرح اللہ کا یہ فطری تصور بھی مختلف قسم کے مبادلوں میں گم ہو کر کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض

اوقات یہ فطرت کچھ اس انداز سے ان پردوں میں چھپ جاتی ہے کہ دیکھنا تو کجا اس کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی، یہاں آکر انسان کی نظریں ان خارجی پردوں سے ٹکرا کر ذاتِ حقیقی سے، منکر ہو جاتی ہیں

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

تحت الثریٰ کی آتش فشانیاں، اوجِ ثریا کی طلعت آفرینیاں، دریاؤں کی وحشت خیز روانیاں، ہواؤں کی تند و تیز جولانیاں، صحراؤں کی بربریت زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، جب ہاتھ باندھے عبدِ مومن کے حضور میں کھڑے ہیں، جب صورت یہ ہو کہ مومن ان کا مخدوم ہو تو پھر ان کی اطاعت، ان کے سامنے جھکنا اور انھیں اِلٰہ بنانا کیا مطلب! لَا کے معنی ہیں کہ ہر غیر اللہ وجود سے بغاوت سرکشی اور انکار۔ جب اس انکار سے ذہن کی زمین ہموار ہو جائے تو پھر اِلّا اللہ یعنی صرف وجودِ الٰہی کی عمارت کی بنیاد رکھدی جائے۔ تمام قوتوں کو راستے سے ہٹا کر صرف ایک قوت (خدا) سے بندے کا براہ راست تعلق پیدا کر دینا قرآن کریم کی بنیادی تعلیم ہے۔ لیکن

وائے افسوس کہ آج مسلمان پھر اُنہی خداؤں سے پیوست ہو رہا ہے
جنھیں مٹا دینے کے لئے لَا کی تعلیم دی گئی اور اِلّٰہ کے ابدی
قانون کو پیش نہیں کیا گیا:

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیّاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کُلہ داری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
اُنھیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
وجود انھیں کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زنّاری



مادہ پرست

شرک کرنے والوں میں سے ایک گروہ وہ ہے جو مادہ کو قدیم مانتا ہے، اس کے نزدیک یہ بات محال ہے کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں آجائے۔ یعنی پہلے بالکل نہ ہو پھر پیدا ہوجائے۔ اس لئے ان کا خیال ہے کہ مادہ کائنات میں خدا کی طرح قدیم ہے۔ فطرت کی نیرنگیاں صرف مادہ کے تغیرات کا نام ہیں۔ بیج سے درخت پیدا ہوتا ہے درخت سے بیج، اس قسم کی غلط فہمیوں کی بنیاد یہ ہے کہ انسان خدا کو بھی اپنے جیسا ایک سمجھ لیتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ انسان کی قدرت سے باہر ہے کہ کسی شئے کو عدم سے وجود میں لے آئے۔ لہذا یہ عقیدہ قائم کرلیا کہ روح۔ مادہ اور خدا تینوں ازلی اور ابدی ہیں۔ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ اس جماعت کے نزدیک مادہ کے بغیر خدا بھی ایسا ہی عاجز (نعوذ باللہ) ہے جیسا کہ مصور بغیر رنگوں کے، اس کی تردید میں قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے۔

"وہ آسمانوں کا اور زمین کا موجد ہے، اس کے اولاد کیسے ہوسکتی ہے جبکہ اس کی کوئی بیوی ہی نہیں، اور اس نے

ہر شئے کو پیدا کیا ہے، اور اُسے ہر شئے کا علم ہے۔ یہ ہے تمہارا رب، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، ہر شئے کا پیدا کرنے والا، پس اُس کی عبودیت اختیار کرو اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے، اس کو کسی کی نگاہ نہیں پا سکتی، لیکن وہ سب نگاہوں کو پا رہا ہے۔ اور وہ بڑا باریک بیں اور باخبر ہے۔" الخبیر (۶/۱۰۲-۱۰۴)

لیکن انسانوں نے اِس خدائے واحد کو چاند سورج ستاروں اور مادہ چیزوں میں دیکھنا چاہا، مگر وہ مردِ مومن جس نے قرآن کی تحقیق سے اِن تمام بلندیوں پر کمندیں ڈال دیں اور اِن تمام اشیاء کو احاطۂ علم میں محدود و اسیر کرلیا اور انھیں مجبور کیا کہ اس کی خدمت میں خادم بن کر رہیں۔

کل ساحلِ دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے
تو ڈھونڈھ رہا ہے سمِ افرنگ کا تریاق؟
اِک نکتہ میرے پاس ہے شمشیر کی مانند
بُرّندہ و صیقل زدہ و روشن و بّراق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق

قرآن کریم میں ارشاد ہے:-

"وہ کون ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، اور تمہارے لئے بلندی سے پانی برسایا۔ اور پھر اس پانی کے ذریعہ ہم نے رونق دار باغات اُگائے۔ تم سے تو ممکن نہ تھا کہ اِن باغات کے درختوں کو اُگا سکو تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی اِلٰہ ہے؟ مگر یہ لوگ ہیں کہ اس پہ بھی راہ راست سے پھرے جاتے ہیں۔ وہ کون ہے جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا، اور اُس کے اندر نہریں چلائیں، اس کے لئے پہاڑ کھڑے کر دیئے، اور دو دریاؤں (یا سمندروں) کے درمیان حدِ فاصل ٹھہرائی۔ تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی اللہ ہے؟ لیکن اِن میں سے اکثر اِس حقیقت کو نہیں جانتے کہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی دعاؤں کو سُنتا ہے جب وہ اُسے پکارتا ہے اور اُس کی مصیبت کو دُور کر دیتا ہے۔ اُس نے تمہیں دنیا میں بادشاہ (جانشین) بنایا، کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہے؟ بہت تھوڑے ہیں جو (فطرت کی اس آواز کو) یاد رکھتے ہیں۔ وہ کون ہے جو بحر و بر کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے۔ جو ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے کہ اِس مژدۂ جانفزا سے اس کی رحمت بارش کی خبریں دیں۔ کیا، اللہ کے سوا کوئی اور بھی اِلٰہ ہے؟ اللہ اِن لوگوں کے شرک سے بلند ہے، وہ کون ہے

جس نے مخلوق کو پہلی بار پیدا کیا اور پھر اس کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ اور وہ کون ہے جو تمہیں پستیوں اور بلندیوں سے رزق بہم پہونچاتا ہے، آسمان سے پانی اور زمین سے شگوفے، کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہے؟ کہو کہ اگر تم اپنے دعوئے شرک میں سچے ہو تو اس کے لئے کوئی دلیل پیش کرو۔ (۲۷-۶۰-۶۴)

رب العالمین، کسی خاص قبیلہ۔ خاص قوم۔ خاص ملک کا خدا نہیں تمام کائنات کا خدا ہے، ہر ایک کا الٰہ ہے۔ سب تعریفیں اُسی کے لئے ہیں۔ جب تمام صفات کا مرکز اسی کی ذات ہے تو تعریفیں بھی اُسی کے لئے ہیں، ان باتوں میں کوئی اُس کا شریک نہیں ——
اِلٰہٌ وَّاحِدٌ۔ ایک واحد اللہ۔ تمام قوتوں کے سرچشمہ کا مالک، جس نظام کے ماتحت سلسلۂ کائنات چل رہا ہے اس نظام کا قادر و مختار۔ جب وہ قادر و مختار ہے تو پھر ساری کائنات پر حکومت بھی اُسی کی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارے زمانہ کی مخلوق اللہ کی محبت کی اسیری سے نکل کر اپنے بنائے ہوئے زندان میں اسیر ہے:

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار

پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدّتِ گفتار ہے نَے جدّتِ کردار
ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اِسی افلاسِ تخیل میں گرفتار

سب سے بڑا معاملہ رزق کا ہے۔ حقیقی اِلٰہ سے سرکشی اختیار کرنے کے بعد انسان سمجھتا ہے کہ میرا رزق فلاں انسان یا قوت کے ہاتھ میں ہے، چنانچہ وہ اُس قوت کے روبرو سر جُھکانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ حالانکہ قرآن نے غیر الٰہی قوتوں کے علاوہ کسی دیگر قوت کے سامنے جھکنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ سختی سے روکا ہے کیونکہ یہی شرک و فساد کی جڑ ہے۔ قرآن رزق کے دروازوں کی کُنجیاں انسانوں سے چھین کر خدا کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اور یوں واضح کردیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہوسکتی جس کے سامنے جُھکا جائے:

"اے نوعِ انسانی تم پر جو اللہ کے احسانات ہیں ان کو یاد کرو، کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تم کو زمین سے اور آسمانوں سے رزق پہنچاتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے، سو تم کہاں اُلٹے جارہے ہو؟" (۵ ۳۵/۳)

فرعون نے اپنے دعوئ ربوبیت کے ثبوت میں یہی چیز پیش کی تھی :۔

اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (۷۹/۲۴) میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنیوالا ہوں۔

رازق ہونے میں یہی باطل دعویٰ سرکش قوتوں کے دماغ میں خدائی کا خناس پیدا کردیتا ہے۔ حالانکہ حقیقی رزاق وہی ہے۔ حکومت وسلطنت اُسی ایک ذات کو زیبا ہے جسے اللہ واحد کہتے ہیں۔ انسانوں کو حکومت اس لیئے دی جاتی ہے کہ وہ اپنے اللہ سے تعاون کرکے اُس کے قوانین کے ماتحت نظامِ کائنات کے توازن کو قائم رکھیں۔ اللہ کی وحدانیت کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے، بشرطیکہ پہلے لا کے تصور سے ذہن کی زمین ہموار کرلی جائے اور پھر اِلٰہ کے تصور کی عمارت کی بنیاد رکھی جائے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے،
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے
وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لَآ اِلٰہ میں ہے
طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیئے
سرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیئے

جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا؟
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیئے
مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روِش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیئے

دنیا نے جن اغراض و مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے لئے الگ الگ معبود تجویز کیئے، قرآن ان تمام صفات کو ایک ذاتِ واحد میں جمع کر دیتا ہے۔ اس اللہ واحد کا تعارف قرآن کریم نے اُس وقت کرایا جب دنیا میں کہیں اس کا صحیح نشان نہیں ملتا تھا، اور یہ اس لئے کہ قرآن کریم خود اس اللہ کی طرف سے دنیا کو مِلا ہے کسی انسانی ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔

"پس یقین مانو کہ یہ قرآن علم الٰہی کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، اور یہ کہ اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ تو کیا تم سرِ تسلیم خم نہیں کرو گے؟" (۱۱/۱۴) ۵

اِسی تعلیم کو نوعِ انسانی تک پہنچانا اور اُس کے ذریعہ سے فطرتِ خوابیدہ کو بیدار کرنا قرآن کا مسلک ہے۔ اِس پیغام کو کائنات تک پہنچانے کے لئے اللہ اپنے فرشتوں سے کام لیتا ہے، اور انسانوں میں سے جس اِنسان پر چاہتا ہے نازل

کرتا ہے۔ یہی وہ انسان ہیں جنھیں مومن کہا گیا ہے، مومن کون ہیں:-

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
نصرت کا سرودِ ازلی اسکے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمان

ضد۔ نفرت یا تعصب (نعوذ باللہ) شانِ کبریائی میں داخل نہیں ہے۔ اللہ نے انسانوں کو ایک الٰہ کی دعوت اس لئے نہیں دی

کہ وہ اقوامِ دیگر کے خداؤں کی پرستش ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا، بلکہ اس لئے کہ اِلٰہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔

"اور زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ بھی ہوتا تو یہ ارض وسما (سلسلۂ کائنات) درہم و برہم ہو جاتا۔ سو اللہ کائنات، جہانبانی کے تخت کا مالک اور اِن باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔" (۲۳/۹۱)

یہ ہوش رُبا کارخانہ اس عمدگی نظم و تنسیق کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کا سارا انتظام صرف ایک قوت کے ہاتھ میں نہ ہو۔ اس کے برعکس دو قوتوں کے مختلف ارادوں کے ماتحت یہ نظامِ عالم ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ دو عملی نظامِ کائنات کو درہم و برہم کر کے رکھ دے۔ اس کا لازمی نتیجہ فساد ہے۔ لیکن جس نظام کی کڑیاں ٹھیک حالت میں سرگرمِ عمل رہیں اس کا نظام اعتدال پر ہوتا ہے۔ ایک انجن کے دو ڈرائیور ہوں تو وہ ایک سمت کی طرف نہیں جا سکتا۔ دو مختلف ارادے اُسے دو مختلف راہوں کی طرف اپنی اپنی منشاء کے مطابق لے جانا چاہیں گے، نتیجہ انجن کی شکست ہے:۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

یہ مختلف خداؤں کا تصور، خواہ برہمن کے دیوی دیوتا ہوں یا اس کی قوتوں کے مختلف مظاہر ہوں جیسے شِو، وشنو وغیرہ۔ ذہنِ انسانی کے عہد طفولیت کی یادگار ہے۔ جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ نظامِ عالم کے مختلف شعبوں میں کوئی اجزا اجزا نہیں بلکہ خود الگ الگ کام کرتے ہیں۔ ہوائیں ایک الگ قانون کے ماتحت چلتی ہیں اور اس کے خدا کا نام وا دیوتا ہے، اور بارش اندر دیوتا کے ماتحت ایک حکم کے ماتحت کام کرتی ہے۔ پیدائش، زندگی، موت ہر ایک شعبہ کے لیئے الگ الگ دیوتا کی ضرورت ہے۔ لیکن عقلِ انسانی (سائینس) نے اپنی بلوغت کو پہنچکر مشاہدات و تجربات سے جب کائنات میں یہ کیفیت دیکھی کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

تو مختلف خداؤں کا عقیدہ پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ آج بھی انسان کی تمدنی عمرانی اور معاشرتی زندگی کو دیکھا جائے تو وہاں بھی متعدد خداؤں کے عقیدہ سے جو فساد رونما ہوتے ہیں۔ دورِ حاضرہ اس کی بدترین مثال ہے۔ یہ تمام فتنہ و فساد اور

عدم اطمینان و فقدانِ سکون کی آگ اس لئے بھڑک رہی ہے کہ انسانوں نے الگ الگ معبود تراش رکھے ہیں۔

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمیِ محفل نہ کر قبول

لا کے بعد مختلف معبودوں کی جگہ ایک اِلٰہ حقیقی پیدا کر کے دیکھئے کہ یہ تمام فساد امن میں تبدیل ہو جاتا ہے یا نہیں۔ فساد تو اسی لئے ہے کہ ایک سے زیادہ ذہنِ انسانی نے اِلٰہ تجویز کر رکھے ہیں۔ ایک قوم کا اللہ دوسری قوم کو جینے نہیں دیتا۔ ایک ملک کا خدا دوسرے ملک والوں کو ایٹم بم کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ ہر فرقہ کا اِلٰہ اپنے گروہ کو لے کر دوسروں پر چڑھائی کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہر جگہ فساد ہی فساد ہے اعتدال کا کہیں نام ہی نہیں ہے۔ دوسرے تو دوسرے خود مسلمان کا یہ حال ہے کہ ایک اِلٰہ پر ایمان رکھتے ہوئے بے ایمانی کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ اور مختلف جماعتیں بنکر مختلف عقائد کی پرستش میں مصروف ہیں:۔

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد

چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

شرک کی حقیقت انسان پر اُس وقت کھلتی ہے جب وہ اپنی عظمت اور جوہر ذاتی کی قیمت سے واقف ہو جاتا ہے، اُس وقت اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اِن حقیر چیزوں کو خدا بنا کر اُس نے اپنے آپ کو کس قدر ذلیل بنا رکھا تھا، اِسی لئے فرمایا کہ

"خدا کے ساتھ کوئی دوسرا معبود تجویز نہ کرو ورنہ ایسے ہو رہو گے کہ ہر طرف سے نفرین کے مستحق اور ہر طرف سے درماندگی میں پڑے ہوئے" (۵ $\frac{۱۷}{۲۲}$)

سورۂ شعراء میں ہے:-

"اور اللہ کے ساتھ دوسرا معبود مت پکار، ورنہ تو ان میں سے ہو جائے گا جو عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں" (۵ $\frac{۲۶}{۲۱۳}$)

خدا کے بندے کبھی کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھکتے۔ بیشک اپنی عظمت سے آگاہ ہو کر دیکھ لیجئے۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی!
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

اصنام پرستی کے علاوہ شرک کے مظاہرے کی اور صورتیں بھی ہیں۔ مجوسی دو مختلف خدا مانتے ہیں، اور ان دونوں خداؤں کو مستقل مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا خدا اور دوسرا بدی کا، ایک نور کا خدا اور دوسرا ظلمت کا۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید فرمائی ہے:۔

"اور اللہ نے کہا کہ دو معبود اپنے لئے نہ بناؤ۔ معبود ایک ہی ہے۔ سو تم لوگ خالص مجھ سے ہی ڈرو۔ ($\frac{16}{51}$ ۵)

دیکھا جائے تو یہ انسان کے اپنے ذہنی تصورات کا آئینہ ہے اور یہی زاویہ نگاہ کی نادرستی کی بین دلیل ہے ورنہ زاویہ نگاہ درست

ہو جائے تو معلوم ہو جائے کہ

میرے ساقی نے عطا کی ہو مئے بے درد و صاف
رنگ جو دیکھتے ہو تم میرے پیمانے کا

عیسائی فرقہ تین خدا مانتا ہے، باپ - بیٹا اور روح القدس اور یہ عقیدہ بھی باطل ہے:

" بلاشبہ اُن لوگوں نے دین میں کفر کیا جنھوں نے کہا کہ خدا تین ہیں، حالانکہ بجز اس ایک معبود کے اور کوئی معبود نہیں۔"

(۵/۷۳)

اہلِ کتاب نے مذہبی احبار و رہبان۔ علماء و مشائخ کو خدا کا شریک بنا لیا تھا۔ یہ عقیدہ انسانی عظمت و تقدس کا نقاب اوڑھکر عقیدت مندی کے راستے قلب و ذہن میں سرایت کرتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا، اس پہ خدا نے فرمایا:-

" انھوں نے اللہ کو چھوڑکر علما، مشائخ کو خدا بنا لیا، اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو حکم یہی دیا گیا تھا کہ وہ اسی ایک الٰہ کی پرستش کریں، جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے، وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔" (۹/۳۱)

پھر ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے نظریہ اور

عقیدہ کے مطابق ہر غالب قوت کو خدا مان لیا اور یہ تمام شیطانی طلسم تھا، ابلیسی نظام تھا، اور آج بھی:

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اُس نے دو صد ہزار ابلیس

زندگی بخشنے والا، پرورش کرنے والا، رزق دینے والا، امن و سلامتی عطا فرمانے والا، ہر وقت نگہبان، بگڑی بنانے والا۔ ہر معاملہ میں کارساز، وہ جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکے، جسے مایوسیوں میں پکارا جائے۔ جس کے قبضہ میں نفع و نقصان ہو، جو حاضر و غائب کا علم رکھتا ہو۔ سب پر غالب، عظمتوں کا مالک، ہر عیب سے منزہ، مالک الملک، شہنشاہِ حقیقی، جس کی زندگی کے لئے فنا نہ ہو، جس کے قیام کو زوال نہ ہو، جو کسی کا محتاج نہ ہو۔ جس کے سب محتاج ہوں۔ کیا اس ہستی کے علاوہ اور بھی اس قابل ہے کہ اُس کی محکومیت اختیار کی جائے؟ لیکن جب تک عقائد میں پختگی نہ آئے گی ہر آقا کا انکار، ہر قوت کی نفی اور صرف اللہ کی اطاعت ممکن نہیں ہے۔ عقائد کی پختگی بڑی

ضروری ہے :-

حکمتِ مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے
ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر
دین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اِس قوم کا بے نورِ عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

جب تک انسان کے سامنے کسی شئے کی مثال پیش نہ کی جائے اس کی سمجھ میں اُس اصل شئے کی ماہیت نہیں آ سکتی۔ اِسی طرح غیر ایمان والوں کے سامنے جب تک اللہ کی سی شئے نہ رکھی جائے، وہ اللہ کی ماہیت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ لیکن اللہ بے مثال ہے، لہذا ہمارے پاس کوئی ایسی مثال نہیں ہے جس کے وجود کو اللہ کی حقیقت منوانے کے لئے پیش کیا جائے۔ اللہ کو مان لینا ہی (ایمان) ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ہے :

"اس کی مثال کوئی شئے نہیں ہے۔" (۴۲/۱۱)

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ اقدس کے متعلق قرآن کریم میں

ایک مثال بیان فرمائی ہے:

"اللہ آسمانوں کا اور زمین کا نور ہے، اُس کے نور کی مثال ایک طاق ہے جس میں ایک چراغ ہے، وہ چراغ ایک قندیل میں ہے، وہ قندیل ایسا ہے گویا چمکتا ہوا تارا، وہ چراغ ایک مبارک درخت زیتون (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی، اس کا تیل ایسا ہے کہ اگر اُسے آگ نہ بھی چھوئے تو بھی معلوم ہوتا ہے کہ روشن ہو جائے گا۔ نورٌ علیٰ نور، اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور سے ہدایت دیتا ہے، اور اللہ لوگوں کے لئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے، اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ (یہ طاق) ایسے گھروں میں ہے جن کی نسبت اللہ نے اجازت دے رکھی ہے کہ بلند کئے جائیں اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے، اور صبح و شام لوگ ان میں اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں" ۵ (۳۵-۲۴/۳۹)

محسوسات کا خوگر انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ ہر حقیقت لباس مجاز میں جلوہ گر ہو۔ یا کم از کم بیان کرنے والا اس انداز سے بیان کرے کہ ذہن میں ایک محسوس پیکر کا تصور نقش ہو جائے۔ یہی وہ بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے انسان نے بت پرستی اختیار کی کیونکہ اُسے تو وجود کی ضرورت تھی اور وہ "آنکھ دیکھے خدا" پر ایمان

کیسے لے آتا، بلکہ وہ تو اِس عقیدۂ ایمان کا مذاق اڑاتا تھا اسلام چونکہ علم و بصیرت کا دین ہے اس لئے اُس نے وہ تمام دروازے بند کردیئے جن کے راستے اِس قسم کی توہم پرستی ذہنِ انسانی میں داخل ہوسکتی تھی۔ اس نے خدا کے متعلق کوئی ایسی مثال پیش ہی نہیں کی جس سے کسی وجود یا محسوس پیکر کا تصوّر پیدا ہو۔ اسلام حقیقت کو صاف حقیقت رکھنا چاہتا ہے۔ ایسا مقدس مذہب آج پھر بُتوں میں اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ وہ مُومن اللہ نے جن کے سینوں کو طاق کہا وہ غیر کے آستانوں پر جبیں سائی کر رہے ہیں اور غیر میں خود کو اور خود میں غیر کو سمارہے ہیں:

جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

غیر مسلم اقوام نے اپنے ذہنی ارتقاء کے مطابق اپنے اپنے خدا متصور کرلیئے۔ اُنھوں نے خدا کا نام دیوتا رکھا اس لئے کہ وہ خدا کے تو منکر ہی تھے پھر خدا کو تسلیم کیسے کرلیتے۔ کسی نے

سوچا کہ انسان کے دو ہاتھ ہیں تو دیوتا کے چار ہونے چاہئیں، لہذا اُنھوں نے اپنے دیوتا کے چار ہاتھ بنا دیئے۔ کسی نے سوچا کہ انسان کا ایک سر ہے تو دیوتا ضرور دس گنا دماغ رکھتا ہوگا، چنانچہ دیوتا کے دس سر بنا دیئے گئے۔ اِس قیاس کے مطابق مختلف خیال کے مختلف فرقوں نے مختلف قسم کے دیوتا بنا کر پرستش گاہوں میں رکھ لئے۔ اور یہ مسلمان جس کا صرف ایک خدا ایک قوم ایک ملت ایک پلیٹ فارم اور ایک نصب العین تھا، بھی منقسم ہو کر رہ گیا۔ یہ بھی ملت سے کٹ کر قبیلوں میں تقسیم ہو گیا، اور اس سے اس کا واحد عقیدہ بھی بتوں میں شریک ہو گیا۔

یہ نکتہ خوب کہا شیر شاہ سوری نے
کہ امتیازِ قبائل تمام تر خواری
عزیز ہے انھیں نامِ وزیری و محسود
ابھی یہ خلعتِ افغانیت سے ہیں عاری
ہزار پارہ ہے کہسار کی مسلمانی
کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زناری

رِزق و عزّت

سامانِ زیست کا دوسرا نام رزق ہے، جب یہ مخلوق پیدا کی گئی تو اُس کے خالق نے سامانِ زیست بھی پیدا کیا۔ جو کبھی آسمانوں سے بارش کی صورت میں نازل ہوتا ہے اور کبھی زمین سے اناج اور پھلوں کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ تمام نظامِ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کے سوا کسی اور کو اس پر کچھ اختیار حاصل نہیں۔ اللہ تعالےٰ سب کو رزق دیتا ہے اس لئے وہ کسی سے رزق کا خواہاں نہیں ہے۔

رزق کی اعلیٰ قسم وہ ہے جسے عزت کی روٹی کہتے ہیں، حضرات انبیاء کرام کو ایسا ہی رزق عطا ہوتا تھا۔ یہ رزق اعمالِ صالح کے عوض میں ملتا ہے۔ اور چونکہ اعمالِ صالح میں ہجرت اور جہادِ فی سبیل اللہ کو بہت بلند مرتبہ حاصل ہے اس لئے مہاجرین کو مجاہدین کے لئے ایسا ہی رزق متعین ہے

چونکہ دنیا میں جبر و استبداد کا نظام اس مصلحت پر قائم ہے کہ ذرائع رزق کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے۔ اس لئے قرآن کریم

نے وضاحت سے کہدیا کہ رزق سوائے اللہ کے کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس کی تنگی اور کشادگی اُسی کے قبضہ واختیار میں ہے۔ البتہ تنگی اور فراخی میں انسان کے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر نشۂ دولت میں بدمست ہو کر سرکشی پہ اُتر آیا تو اُس کی صورت تباہی میں بدل جائے گی۔ اگرچہ بظاہر نظر یہی آتا ہے کہ صاحب دولت خوب پھولتے پھلتے رہتے ہیں، لیکن جس طرح ہر پودے کو پھل لانے کے لئے ایک مقرر وقت درکار ہے اسی طرح ہر عمل کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے بھی ایک میعاد کی ضرورت ہے۔ حصولِ رزق کے لئے کوشش اور جدوجہد ازحد ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فضلِ خداوندی کا متمنی رہنا بھی لازمی ہے، اس لئے کہ کوئی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی جب تک کہ اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہو۔ آج دنیا اس لئے مصائب میں بتلا ہے کہ اُس نے خدا کی ہستی کو بالکل بُھلا رکھا ہے، اور اس طرح ایسے نظامہائے زندگی وضع کر رکھے ہیں جن کا نتیجہ عدم سکون کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ نظام ذلت و رسوائی کا نظام ہے؛ یہ روٹی ذلت کی روٹی ہے۔

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی



اللہ اور مومن

عرشِ الٰہی کا قرآنی تصوّر یہ ہے کہ:۔

"وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔" (۲/۲۵۵)

"اُس کا تخت آسمان و زمین کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے"

عرش کے معنی چھت، اور کرسی کے ہیں لیکن جب اس لفظ کو اللہ کی طرف منسوب کیا جائے گا تو نہ اس کے معنی چھت کے ہونگے اور نہ ہی کرسی کے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں وجود رکھتی ہیں اور وجود رکھنے والی چیز وجود رکھنے والے کے لئے ہوتی ہے چونکہ اللہ نور ہے اس لئے عرش و کرسی پر وجود ثابت نہیں ہوتا، بلکہ یہ بھی نور ہے اسی نور کی ہر جگہ حکومت ہے یہی نور ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ جس خدا کی قوت و جبروت، اختیار و قبضہ اور حکومت و سطوت کا یہ عالم ہو اُس کے تابع فرمان بندوں کی قوتیں بھی کیسی حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہوں گی۔ ضعف و ناتوانی، بے کسی و بیچارگی، محکومی و غلامی ان بندوں کے پاس نہیں پھٹک سکتی، وہ خود صاحبِ قوت ہوں گے، اور دنیا بھر کے ناتوانوں کی پاسبانی کے کفیل، زندگی

کے سرچشموں پر ان کا قبضہ ہو گا۔ ان کا تختِ حکومت ہر مقام پر بچھا ہوگا۔ اللہ کی شانِ جلال اِن میں منعکس ہوگی۔ ایسے بندوں کی قوتوں کا کیا حساب:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں



دُعا و دَوا

دوا فطری طور پر مرض یا مریض پر صادق آتی ہے۔ تندرست آدمی کو کبھی کسی دَوا کی حاجت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہر مریض قوم کو دَوا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، دوا مرض کا فطری علاج ہے، لیکن دُعا نفسِ انسانی پر ایک مؤثر شئے ہے، دُعا سے ضمیرِ انسانی کو سہارا ملتا ہے، جب قضا کے سامنے دعا ناکام ہوجاتی ہے تو انسان کی نفسیاتی کیفیت میں ایک انقلاب آجاتا ہے جب وہ فیصلہ کرلیتا ہے کہ مصیبت جو آنے والی ہے دُعا سے رُک نہیں رہی بلکہ بڑھتی چلی آرہی ہے تو پھر جذبہ و استقلال سے اُس کے مقابلہ کے لئے مردانہ وار کھڑا ہوجاتا ہے۔ ٹھیک اس وقت ناتوانی کے بدلے عزم واستقلال کے جوہر چمک جاتے ہیں اور انسان کی نفسیاتی ماہیت اِس انداز سے بدلتی ہے کہ اس وقت وہ دُعا کے تصور پر تبسم ریز ہوتا ہے۔

تِری دُعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

رازِ بقا

عقل ہمیشہ محسوسات پر حکم لگاتی ہے۔ اس کے سامنے زندگی صرف حیاتِ طبعی کا نام ہے۔ ہماری آنکھ دیکھتی ہے کہ ایک شخص بے حس و حرکت ہو گیا ہے، نبض بند ہو گئی ہے، عملِ تنفس ختم ہو گیا ہے، عقل نے فیصلہ کر دیا کہ وہ مر گیا، ختم ہو گیا، عقل اِس سے آگے جا ہی نہیں سکتی، جیسے نگاہ ایک خاص حد سے آگے نظر نہیں کر سکتی، لیکن جب کسی آنکھ پر دُوربین لگا دی جائے تو اُس کی حدِ نگاہ بہت آگے بڑھ جاتی ہے، وہ دیکھ سکتی ہے کہ جس مقام پر عقل نے فنا کا حکم لگا دیا تھا وہ اُس کی اپنی کم نگاہی تھی، انسانی زندگی طبعی موت سے ختم نہیں ہوتی، یہ ایک جوئے رواں ہے، جو نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی چلتی رہتی ہے لہٰذا وہ عقل جس بقا اور ہمیشگی کی فکر میں رہتی ہے وہ محض طبعی زندگی تک محدود ہوتی ہے جس میں کہیں بقا اور مداومت نہیں۔ اس کے برعکس تعلیمِ فطرت (وحیِ آسمانی) اس زندگی کو طبعی زندگی سے آگے لے جاتی ہے اور حقیقی بقا کا سامان فراہم کرتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس

بقا کے لئے طبیعی زندگی کو جلد سے جلد ختم کر دینا ضروری ہوتا ہے
وحیِ آسمانی کی رُو سے طبیعی زندگی کا تحفظ اور عزت و تکریم کے
ساتھ تحفظ نہایت ضروری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایسا وقت آجائے
جب ابدی زندگی کے لئے اس طبیعی زندگی کو ختم کر دینا پڑے
تو اُس وقت عقل کبھی ایسا اقدام نہیں کرنے دے گی، اس لئے
کہ اس کا کام یہی ہے کہ انسان کی طبیعی زندگی کی حفاظت کرے۔ اُس
وقت ایمان (عشق) آگے بڑھے گا اور حیاتِ طبیعی کے محدود پردول
کو اُلٹ کر دکھا دے گا کہ یہ جوئے رواں کہاں تک بڑھے چلی
جارہی ہے۔ یہ اُس حقیقی بقا کی خاطر اِس طبیعی زندگی تک کو بھی
قربان کر دے گا۔ بس یہ ہے فرق عقل و عشق (ایمان) میں؛ وہ
ابلیسی فریب، یہ نورانی حقیقت:

"نہیں (بدبختی یہ ہے کہ) تم پیش افتادہ مفاد ہی کو پسند کرتے ہو
اور مستقبل (آخرت) کو چھوڑ بیٹھتے ہو۔ (بیگانہ ہو جاتے ہو) ($\frac{۷۵}{۲۰-۲۱}$)

صحیح مسلکِ حیات یہ ہے کہ عقل کو اُس کی حد سے آگے نہ
بڑھنے دیا جائے، اس کا منصب صرف طبیعی زندگی کی حفاظت کے
لئے سامان فراہم کرنا ہے۔ بس اس میں اِس سے پورا پورا کام لیا
جائے کہ طبیعی زندگی اِس سلسلۂ ارتقاء کی ایک کڑی ہے کر بھی

کا مضبوط ہونا خود پوری زنجیر کی مضبوطی کی دلیل ہے۔ لیکن جب ابدی زندگی کا سوال سامنے آجائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کے لئے وہ سامان و اسباب جو عقل نے طبعی زندگی کے تحفظ کے لئے فراہم کر رکھے تھے قربان کر دینے پڑیں گے، اس وقت بغیر سوچے عشق کے فرمان کی تعمیل لازم ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی



تسخیر کائنات

"کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے کس طرح زمین کی تمام چیزیں تمہارے لئے مسخر کردی ہیں۔ جہاز کو دیکھو کس طرح وہ اس کے حکم سے سمندر میں تیرتا چلا جاتا ہے۔ پھر اسی نے کس طرح فضائی گردوں کو تھامے رکھا ہے کہ وہ زمین پر نہ گرنے پائیں۔ مگر جب اس کا اذن ہو، بیشک اللہ انسانوں کے لئے بڑا رحیم ہے رؤف ہے۔" ۵ (۲۲/۶۵)

"دنیا کے سائینس داں ایک عمر کی کاوش کے بعد اب اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ مریخ والوں سے سلسلۂ گفت و شنید پیدا کرلینا ممکن ہے، لیکن قرآن نے بہت پہلے سے اعلان فرما دیا ہوا ہے کہ مریخ والوں سے باتیں کرنا تو ایک طرف تمام اجرام فلکی وغیرہ انسان کے لئے مسخر کردیے ہوئے ہیں۔ تبھی تو زمین نے ان الفاظ میں آدم کا استقبال کیا:

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

صرف دریا اور پہاڑ اور سورج اور چاند ہی نہیں بلکہ ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے سب انسان کے تابعِ فرمان ہے۔ بشرطیکہ اس میں غور و فکر کیا جائے۔

"اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ اس میں جہاز اُس کے حکم سے چلتے جائیں اور اس طرح تم رزق کی تلاش کرو، اور یوں اس کے سپاس گذار بندے بنو، اور ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے اُس نے سب تمہارے لئے مسخّر کر دیا۔ یقیناً اس میں غور و فکر کرنے والی قوم کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ ($\frac{۴۵}{۱۲-۱۳}$)

بلکہ اس سے بھی آگے ظاہر و باطن کی تمام نعمتیں۔ انفس و آفاق کی تمام قوتیں اس کے زیرِ حلقۂ کمند ہیں:

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

دنیا میں جس قدر فساد اور خوں ریزیاں، ظلم و استبداد ہے سب کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے علم و عقل کو سرکش و بیباک چھوڑ رکھا ہے، اور اسے اپنے سے بلند و بالا ہستی کے قوانین کے تابع و مطیع نہیں رکھا۔ اسی کا نام ابلیسی نظام نظام ہے، جس میں ہر وہ شخص، جماعت یا قوم جو دوسرے کو فریب دے سکے۔ یعنی وہ جو دوسرے کے علم و عقل سے زیادہ علم و عقل رکھے اور اُسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا جائے نہایت کامیاب ہے۔ علم کو جب وحیِ الٰہی کے ساحلوں میں محدود نہ رکھا جائے، تو یہ ایک ایسا پُرشور دریا بن جاتا ہے۔ جس کی طغیانیوں کے سامنے عدل۔ انصاف۔ اخلاق تہذیب۔ تمدن۔ جڑ سے اکھڑ کر بہے چلے جاتے ہیں۔

اِس سیل و سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھکر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

ابلیس سے نجات

ابلیس ازل سے ہے اور قیامت تک رہے گا، اس کا نظام موجود رہا ہے اور رہے گا، لیکن سوال یہ ہے کہ جب اس کا نظام قیامت تک رہیگا تو پھر اِس سے چھٹکارا کیونکر نصیب ہو سکتا ہے؟ مشرق کی رہبانیت نے اِس کا علاج یہ سوچا کہ دردِ سر کی دوا یا علاج کی بجائے سر کو اُڑا دیا جائے۔ یعنی شرفِ انسانیت حاصل کرنے کی بجائے رہبانیت اختیار کی جائے۔ نہ اِس نظام میں رہیں گے نہ اِس کا خوف پیدا ہو گا۔ یعنی ترکِ دنیا سے دنیا کے فکر ختم ہو جائیں گے اور ساری کشمکش حیات سے چھٹی مِل جائیں گی۔ مگر انھیں یہ معلوم نہیں کہ یہ اپنی شکست کا اعتراف ہے، ضعفِ خودی کی دلیل ہے۔ یہ انتہائی یاس اور نا اُمیدی کا مظاہرہ ہے جو ابلیس کا مقصود ہے۔ اگر فطرت کا مقصود بھی یہی ہوتا کہ انسان غاروں میں جا بیٹھیں تو کشمکشِ حیات کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس صورت میں تو خلافتِ ارضی کے لئے آدم سے بڑھکر فرشتے زیادہ موزوں تھے۔ عجمی تصوّ

نے سوچا ہی نہیں کہ خودی کے عروج و ارتقا کے لئے کش مکش حیات ابلیسی قوتوں سے مقابلہ کس قدر ضروری ہے۔ یہ تصادم عین فطرت کے مطابق ہے:

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

یاد دہانی

"اِنَّ ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ (۷۳/۱۹) یقیناً یہ قرآن ایک تذکرہ ہے۔

کسی بھولی ہوئی بات کو یاد دلا دینا تذکیر کہلاتا ہے۔ یہ بات جس کی یاد دہانی کرادی جاتی ہے کوئی نئی نہیں ہوتی بلکہ ذہن کے کسی گوشہ میں چھپ کر بیٹھی ہوتی ہے۔ بھول کا ایک ایسا پردہ اس کے درمیان حائل ہوتا ہے کہ یادداشت کی نگاہ اُس تک نہیں پہنچتی۔ جونہی یاد دہانی کے زور سے وہ پردہ اُٹھا دیا جاتا ہے وہ بھولی ہوئی بات نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے۔ اسی شئے کا دوسرا نام وحی ہے اور وحی کسی پر ٹھونسی نہیں جاتی بلکہ یہ تو اُس کی فطرت کے بھولے ہوئے افسانوں کی یاد تازہ کراتی ہے جس سے گم گشتہ کہانی جنتِ نگاہ بن جاتی ہے۔ یہ وحی درحقیقت ہمارے ہی داعیاتِ نفسِ صالح کی ترجمان ہے:

محمدؐ بھی تیرا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اعلان

شیطان حق و صداقت کی راہ روکے کھڑا رہتا ہے۔ انسانوں کا وہ قافلہ جو شیطان کی متعین راہوں پر چلتا ہے وُہ راہ کی گُل کاریوں کے دل فریب مناظر سے متاثر ہوکر چلا جاتا ہے اور نہیں دیکھتا کہ اِن نظرفریب وادیوں کے پیچھے ہلاکت و بربادی کے کتنے بڑے ہولناک غار ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ دانشمند ہوتے ہیں، آنکھیں رکھتے ہیں، دیکھتے ہیں، لیکن آنکھیں تو اُس وقت کام دے سکتی ہیں جب فضا منور ہو، تاریکی میں آنکھیں کیا کام دیں گی۔ حضرت ہود نے جب اپنی قوم سے کہا کہ

"اے میری قوم! میں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ڈراتا ہوں"۔ (۲۶/۱۳۵)

تو قوم کی طرف سے جواب ملا:۔

"خواہ تو ہمیں نصیحت کرے یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ بنے ہم پر سب برابر ہے (ہم تیری نصیحتوں سے کوئی اثر لینے والے نہیں) یہ تو (ہمیشہ سے) پُرانے (خیالات کے) لوگوں کی عادت رہی ہے کہ وہ خواہ مخواہ لوگوں کو ڈراتے رہا کرتے ہیں، اور نہ

ہی ہمیں کوئی عذاب دیا جائے گا۔" ($\frac{۲۶}{۱۳۸-۱۳۶}$)

وہ بار بار ایک ناصح امین کی طرح انھیں ان کے اعمال کے انجام سے آگاہ کرتے تھے، لیکن وہ لوگ ہر بار یہی کہتے تھے کہ:

"اگر تم سچے ہو تو وہ بات لا دکھاؤ جس کا ہمیں خوف دلا رہے ہو۔ ($\frac{۴۶}{۲۲}$)

یہی حال اقوامِ مغرب کا ہے، جن کی دوربینیں مریخ تک کے احوال و کیفیات کا پتہ تو لے آتی ہیں لیکن تباہی و بربادی کا جو سیلاب ان کے دروازوں سے ٹکرا رہا ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ حالانکہ ایک ناصح امین اس مستقبل کا اعلان کر رہا ہے۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

سعادت ونحوست

قرآن کریم نے اُس دن کو بہت منحوس کہا ہے جس دن کسی قوم پر اللہ کا عذاب طاری ہو:۔

"ہم نے دنیاوی زندگی میں ذلت و رسوائی کا عذاب چکھانے کے لئے چند منحوس دنوں میں اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی۔ اور یہ تو کچھ بھی نہیں، بلاشبہ آخرت کا عذاب زیادہ رُسوا کُن ہوگا اور وہ وہاں کسی قسم کی مدد حاصل نہیں کر سکیں گے۔" ($\frac{52}{19}$)

اِس سے معلوم ہوا کہ سعادت و نحوست کا تعلق آسمان کے ستاروں سے نہیں بلکہ جب کسی کے بُرے اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا وقت آجائے۔ تو وہ گھڑی اس کے لئے نحس ہے۔ لہٰذا وہ سعادت و نحوست خود انسان کے اپنے اعمال کے نتائج کا نام ہے، ستاروں کی گردش کا نام نہیں ہے۔ ستارے تو انسان کے تابع فرمان قرار دیئے گئے ہیں، چنانچہ جو مسخر ہو وہ مقدرات کی تبدیلیوں پر کیا اختیار رکھ سکتا ہے۔

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو تابعِ ستارا نہیں



منزل بہ منزل

مغرب کے انسانی نظریۂ ارتقا کا ماحصل یہ ہے کہ انسان جس شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے، ابتداءً اسی شکل میں وجود میں نہیں آگیا تھا، بلکہ مختلف منازل سے گذرتے گذرتے اس مقام تک پہنچا ہے۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے قرآن کریم سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اس تائید کے باوجود دونوں نظریات میں بنیادی فرق ہے، اور ایسا بنیادی فرق ہے، جن کی رُو سے حیات اور کائنات کے متعلق جو مختلف تصورات قائم ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کائنات کے متعلق میکانکی تصوّر اُنیسویں صدی کے مادہ پرست علمائے طبعیات کی تخلیق ہے، جو یورپ میں نظریۂ ارتقا کے اولین علمبردار ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی غیرفانی مادہ میں بعض کیمیائی اور طبعیاتی تبدیلیوں سے خود بخود (محض اتفاقی طور پر) پیدا ہوگئی اور اس طرح کاروانِ حیات ارتقائی شاہراہ پر گامزن ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ اوّلینِ کیفیت حیات نے (میکانکی طور پر) حیوانی پیکر

کی صورت اختیار کرلی۔ اس کے بعد حیوانی دماغ میں بعض اس قسم کی کیمیائی اور طبیعی تبدیلیوں سے شعور پیدا ہوگیا۔ اور اس طرح یہ شعور انسان کی شکل میں متشکل ہوگیا۔ اس کے بعد جب یہ میکانکی ارتباط منتشر ہو جائیگا تو زندگی اور شعور سب ختم ہو جائینگے لہٰذا زندگی یہی طبیعی زندگی ہے اور اسی کا تحفظ انسانی نصب العین ہے ـــــ اس کے برعکس قرآن کریم کی رُو سے زندگی بے جان مادہ میں کیمیائی اور طبعیاتی تبدیلیوں کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی انسانی شعور حیوانی دماغ کے میکانکی ارتقار کی اگلی منزل ہے۔ زندگی اور شعور کا سرچشمہ وہ اللہ ہے جو اپنی حکمت کے ماتحت اس کائنات کو وجود میں لایا، اور اس کے بعد اپنی حکمتوں کے ساتھ اسے اس کے منتہیٰ کی طرف لے جا رہا ہے۔ چنانچہ انسان کی موجودہ زندگی ارتقار کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ تمہید ہے۔

حیات ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جو کائنات کی رگ و پے میں جاری ہے۔ انسان حیات کے علاوہ شعور کا بھی حامل ہو باقی کائنات شعور سے خالی ہے۔ مغرب کے سائنس داں نے آکسیجن اور ہائیڈروجن کو دیکھا اور جب ان دونوں کو ملایا تو ان

کے باہم ملنے سے پانی بن گیا۔ لیکن تجزیہ سے ثابت ہوا کہ جو خاصیتیں پانی میں ہیں، وہ ان دونوں گیسوں میں موجود نہیں ہیں، لہذا وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ بے جان مادہ میں جب زندگی پیدا ہوتی ہے تو وہ مادہ کے میکانکی ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ زندگی کیسے وجود میں آجاتی ہے، اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا، اس لئے اس کا نام ہنگامی ارتقاء رکھ لیا گیا۔ ان کے زندگی میں اور اس قسم کے دیگر ہنگامی ارتقاء شعور کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس نظریہ پر بہت اعتراضات ہوئے اور آخرکار اس نظریہ کا جنازہ اُٹھ گیا۔ اگرچہ مغربی مفکرین اس میکانکی تصورات کی حدود سے بہت آگے نکل چکے ہیں لیکن وہ تہذیب جو میکانکی بنیادوں پر استوار ہوئی تھی اُنہی بنیادوں پر رہی۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ چونکہ یہ بھی بنیادی غلطی تھی لہذا یہ نظریہ بھی اور یہ تہذیب جدید بھی ان ٹھوس حقائق کا سامنا نہ کر سکی جسے قرآن کریم نے پیش کیا۔ انسان ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد غلط اُصولوں پر رکھی گئی ہو قائم نہیں رہ سکتا، خواہ اِس غلط انتظام کو کیسی ہی دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ جیسے درخت کا تنا کھوکھلا ہو تو اُس پر پانی چھڑکنے سے اُسکی مضبوطی قائم

نہیں رہ سکتی نہ ہی اُس پر سبزہ اُگ سکتا ہے کیونکہ اُس کے اندر نشو ونما کی قوتیں ہی نہیں ہیں۔ جب تک اس کا کھوکھلا پن موجود ہے اس کی تباہی یقینی ہے، تدبر کے معجزے اسے زندگی نہیں دے سکتے۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو



خاکِ وطن

مسلمان کا وطن وہ ہے جہاں اللہ کی حکومت ہو۔ اگر کسی زمین پر قانون الٰہی زندہ نہیں ہے، تو یہ فضا مسلم کے مسلک کی سازگار نہیں ہو سکتی۔ ہجرت اس مسلکِ حق پرستی کی زندہ شہادت ہے۔ کہ مسلم انسانی محکومیت کی جراثیم آلود فضا میں پرورش نہیں پا سکتا۔ اسے سب سے پہلے اِس فضا کو اپنے مسلک کے ساتھ سازگار بنانے کی انتہائی کوشش کرنا چاہیئے۔ لیکن جب وہ دیکھ لے کہ فضا کی کثافتیں ایسی محکم ہو چکی ہیں کہ ان کا ردِ عمل ممکن نہیں ہو تو بجائے اس کے کہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر اِس غیر موافق ماحول میں غیر فطری زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے اُسے لازم ہے کہ اِس کی حدود سے نکل جائے۔ اور کسی ایسی زمین پر چلا جائے، جہاں حکومتِ الٰہیہ کے قیام و بقا کے اسباب موجود ہوں یا نظر آتے ہوں۔ یہ ہے خاکِ وطن کی تعبیر۔ مومن کے پاؤں میں زنجیر نہیں ہے کہ کسی خاص زمین میں پیوستہ ہو کر رہ جائے۔ وہ تو فطری طور پر آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ کہ جہاں اُسنے انسانی غلامی

پر مجبور کیا جائے وہاں سے نکل کر خدا کی غلامی میں چلا جائے۔

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا



عظیم قربانی

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اطاعت گذار فرزند جمیل سے کہا کہ میں نے رات خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، اور اس میں اللہ کا اشارا موجود ہے، کہو تمھارا کیا خیال ہے:-

"اے فرزند میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں
کہو تمھارا کیا خیال ہے" (۳۷/۱۵۲)

اُس سعادت مند بیٹے نے جواب میں عرض کیا:-

"ابا جان! جو آپ کو حکم دیا گیا ہے بلا تامل کر گذریے،
انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے (۳۷/۱۵۲)

باپ نے اپنی تمام شفقت اور بیٹے نے اپنی جوانی کو اُس محبوب حقیقی کے ایک اشارہ پر قربان گاہِ عشق میں بلا تامل نذرانے کے لئے پیش کر دیا:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

مقامِ اکبر

ارشادِ خداوندی کی تعمیل میں باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا چُھری تیز کرلی اور ہاتھ میں لی، زمین کانپ اُٹھی کہ اس میں خونِ اسمٰعیل کے ایک قطرے کے متحمل ہونے کی ہمت نہ تھی۔ آسمان محوِ حیرت تھا کہ اس کی آنکھ نے اس سے پہلے ایسا عدیم المثال نظارہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ تسلیم ورضا کی آخری منزل تھی، اور یہ مقامِ اکبر تھا جو صرف حضرت اسمٰعیل کو ہی نصیب ہوا۔ یہ وہ مقامِ اکبر تھا جہاں اور جس کی بلندیوں پہ پہنچکر انسان مسلم کہلانے کا مستحق ہوتا ہے:

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

بُت کدے

"اے پیروان (دعوتِ ایمانی) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے (احکام اللہ کا اتباع کرو) اور اُسی سے ڈرو۔ اور نماز کے نظام کو قائم کرو۔ اور شرک کرنے والوں میں سے نہ بن جاؤ۔ اُن لوگوں میں سے نہ بن جاؤ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ اندازی کی اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ پھر ہر گروہ اپنے اعتقادات پر خوش ہے جنہیں وہ لیے بیٹھا ہے۔٥ (۳۵ / ۳۱-۳۲)

ہماری آج کی دنیا میں اس سرے سے اُس سرے تک شیعہ۔ سُنی۔ حنفی۔ شافعی، مقلد اور غیر مقلد وغیرہ بھی ملیں گے۔ اگر نہیں ملیں گے تو صرف مسلم نہیں ملیں گے۔ آج لفظ مسلمان بھی تعارف کے لیے کافی نہیں رہا اُس کے ساتھ تفصیل ضروری ہو گئی ہے کہ کون مسلم؟ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نہ یہود تھے نہ نصاریٰ، پھر انہیں نسبتوں سے کیا تعلق۔ اسی طرح حضور اکرم حضرت رسولِ خدا بھی نہ شیعہ تھے نہ سُنی فقط مسلم تھے۔ کیا یہ نسبتیں بعد کی پیداوار نہیں ہیں۔ اور کیا یہ ہماری اختراع نہیں ہے؟ ع

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی

تلخیاں

جب حق سے انکار، سرکشی اور بغاوت کرنے والوں کے پاس کوئی معقول جواب نہیں رہتا تو وہ استبدادی قوتوں کی دھمکیوں پر اتر آتے ہیں کہ یا تو اپنے مسلک سے باز آجاؤ یا مُلک بدر کر دئیے جاؤ گے۔ لیکن جن کی آنکھیں حقیقت سے آشنائی پیدا کر چکی ہوں وہ اِن کمزور دھمکیوں سے کیسے مرعوب ہو سکتے ہیں۔ جب حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو حق کی دعوت دی تو اُنھوں نے کہا:۔

"اے شعیب! کیا تیری یہ نمازیں (جو تو اپنے خدا کے لئے پڑھتا ہے) تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آکر کہے۔ ان معبودوں کو چھوڑ دو جنھیں تمہارے باپ دادا پوجتے رہے ہیں۔ یا یہ کہ تمھیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو"۔ (۱۱/۸۷)

حق و صداقت کو کس طرح روکا جاتا ہے، ازل سے یہی ہوتا

آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ دعوتِ حق و صداقت کا معیار ہی یہی ہے کہ اس کے مقابلے میں طاغوتی قوتیں میدان میں آجاتی ہیں۔ اور جس دعوت کی پرورش طاغوتی قوتوں کے دامن میں ہو اُن کا تو خدا ہی حافظ ہے

غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز



زیر و بالا

جب حضرت موسیٰؑ مصر سے نکلے تو اُن کے سامنے کوئی متعین منزل نہ تھی، مایوس نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھیں جہاں سے ہر ایک کو سہارے ملتے ہیں۔ اور پھر وہ مدین کی طرف روانہ ہو گئے:

اور جب موسیٰ مدین کے پانی پر پہنچا تو وہاں کچھ لوگوں کو اپنے مویشیوں کو پانی پلاتے دیکھا (آدمیوں کے علاوہ) دو عورتوں کو بھی دیکھا، جو اپنے جانوروں کو روک رہی تھیں۔ موسیٰ نے اُن سے کہا کہ تمہارا کیا معاملہ ہے (یوں الگ کھڑی ہوئی اپنی بکریوں کو کیوں روک رہی ہو؟) اُنھوں نے کہا، جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو نہ لے جائیں ہم پانی نہیں پلا سکتیں۔ اس لئے کہ ہم کمزور عورتیں ہیں اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔" (۲۸/۲۳)

آپ آگے بڑھے اور ان کمزوروں کے جانوروں کو خود پانی پلایا، اور پھر وہیں سائے میں آکر بیٹھ گئے۔ اور دل میں کہنے لگے کہ مصر کو چھوڑا تھا کہ وہاں حق کی بجائے ظلم کا حکم

رواں تھا۔ چاہا یہ تھا کہ وہاں جا رہیں جہاں کمزوروں کو ستانے والا کوئی نہ ہو، لیکن اس زمین پر تو کوئی گوشہ ایسا نہیں نظر آتا جہاں امن اور سلامتی مسکرا رہی ہو۔ انسان کی ضروریاتِ زندگی کے لئے اللہ نے بغیر معاوضہ ایسی نعمتیں عطا فرما رکھی ہیں جو کسی کی جاگیر نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً ہوا۔ پانی۔ جنگل۔ پہاڑ۔ زمین۔ سبزہ۔ پھل وغیرہ۔ لیکن جبر و استبداد کی قوتیں خدا کی نعمتوں پر اس انداز سے قبضہ جما لیتی ہیں جیسے اُن کے باپ کی جاگیر ہو۔ حالانکہ یہ چیزیں ان انسانوں نے اپنے کسب سے پیدا نہیں کی ہیں، اور وہ جانتے ہیں کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ساری کائنات کے تصرف کے لئے ہیں۔ ان کی تقسیم زیر و بالا، کمزور اور زبردست میں نہیں ہونی چاہیے۔ یہ نعمتیں تو سب کے لئے مفت ہیں، پھر اُن پر غلبہ کیسا، کوئی ان سے پوچھے کہ:-

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے! کس کا ہے یہ نورِ آفتاب

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب
دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں



قوت و دیانت

وہ کمزور لڑکیاں جن کی بکریوں کو حضرت موسٰی علیہ السلام نے پانی پلایا تھا اپنے گھروں میں گئیں، اور باپ سے کہا کہ آج ایسا واقعہ پیش آیا ہے، باپ نے کہا کہ جاکر اُسے گھر لے آؤ۔ جب حضرت موسٰی اُس ایک لڑکی کے ہمراہ اُس کے باپ کے پاس گئے، تو لڑکی نے باپ سے کہا کہ اسے اپنے ہاں ملازم کیوں نہ رکھ لیا جائے، کیونکہ یہ صاحب ایمان بھی ہے اور قوی بھی ہے:

"ان میں سے ایک لڑکی نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان اسے اپنے ہاں نوکر کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ بہترین نوکر ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ یہ قوی بھی ہے اور امین بھی۔ (۲۸/۲۶)

یہ آخری دو لفظ بہترین نگران کی ترجمانی کرتے ہیں۔ منتظم کے لئے صاحبِ قوت ہونا بھی ضروری ہے، اور صاحبِ ایمان ہونا بھی۔ جب تک یہ دو قوتیں یک جا نہ ہوں کوئی منتظم نظام کو صحیح طور پر نہیں چلا سکتا۔

لڑکی کے باپ نے معاملہ پر غور کرکے ایک صورت نکالی،

"اُس نے موسیٰ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تیرے ساتھ کردوں، اس شرط پر کہ تو آٹھ سال تک میری نوکری کرے۔ پھر اگر تُو دس سال پُورے کردے تو یہ تیری طرف سے (حسن معاملہ) ہوگا میں یہ نہیں چاہتا کہ تجھ پر ناجائز بوجھ ڈالوں۔ اگر اللہ نے چاہا تو تو مجھے اچھے لوگوں میں سے پائیگا۔ (۲۷/۲۸)

حضرت موسیٰ نے اس سوال کے جواب میں کہا۔

"کہ یہ تیرے اور میرے درمیان عہد ہوا، جو بھی مدت آٹھ یا دس سال کی میں پوری کردوں مجھ پر کوئی پابندی یازیادتی نہ ہوگی جو کچھ ہم کہتے ہیں اُس پر خدا کارساز ہے۔" (۲۸/۲۸)

یہ صاحب جن کے ہاں حضرت موسیٰ اس انداز سے مہمان ہوئے؛ وہ حضرت شعیب ہی تھے، ایک طرف تو اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ کے لئے ایسا انتظام کردیا کہ وہ فرعون کے محلات میں پرورش پاکر سیاست کے رموز و اسرار سے واقف ہوجائیں اور ادھر یہ سبیل پیدا کردی کہ حکومت الٰہیہ کے قرینے سیکھ لیں:

اگر کوئی شعیب آئے میّسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

فرعون و کلیم

دنیا میں ہر مستبد قوت رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضے میں کر لیتی ہے، اسی طرح فرعون نے بھی کر رکھا تھا بلکہ اپنی ربوبیت کا اعلان بھی کر دیا۔ اس پر حضرت موسیٰ نے کہا میرا رب تو رب العالمین ہے جو تیرا بھی رب ہے۔ فرعون یہ سن کر تلملا اٹھا، اور طنز کے لہجے میں حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ سنتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ حضرت موسیٰ نے پھر الفاظ دہرائے اور کہا:۔

"کہا (وہ اللہ) تمہارا رب ہے اور تمہارے بزرگوں کا بھی رب ہے"۔ (۲۶/۲۶)

فرعون نے پھر اہلِ دربار کی طرف دیکھا اور کہا۔ سنتے ہو اب یہ کیا کہہ رہا ہے؟ میں اور میرے پہلے بزرگ یعنی وہ تمام شہنشاہ جن کی عظمت کے سامنے دنیا کانپتی تھی اس کے نزدیک محتاج تھے۔ کیا ایسی باتیں کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے!

"فرعون نے کہا، یہ رسول کہ جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ دیوانہ ہے"۔ (۲۶/۲۷)

حضرت موسیٰ نے فرعون کی اس گستاخ تنقید پر اسی بے رخی کا برتاؤ

کیا، اور پھر فرمایا کہ وہ اللہ صرف تمہاری حکومت کے دائرہ میں بسنے والوں کا ہی خدا نہیں ہے بلکہ وہ ارض و سموات کا رب ہے۔

"موسیٰ نے کہا کہ وہ ذات مشرق و مغرب اور اُن کے مابین جو کچھ ہے، سب کا رب ہے۔ اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو تو اس حقیقت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔" (۲۶/۲۸)

فرعون نے سُنا اور غصّہ سے لال پیلا ہوگیا، اب جو اُس نے دیکھا کہ اُس کے دعویٔ ربوبیت کی یوں سرِ محفل دھجیاں اُڑائی جارہی ہیں، تو ظلم پہ اُتر آیا جو ظالم قوتوں کا خاصّہ ہے۔ اور کہا:

"اگر تو میرے سوا کسی اور کو خدا تسلیم کرے گا تو قید وبند میں جکڑ دوں گا۔" (۲۶/۲۹)

ایک فرعون کا کیا ذکر، دنیا میں ہر فرعونی قوت انسانوں کو اپنے سامنے جھکانا چاہتی ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بُولہبی

جب مصری مظلوموں کا ایک گروہ حضرت موسیٰ کی اطاعت میں آگیا تو فرعون کے ماننے والوں نے فرعون سے کہا کہ حضرت موسیٰ کی اطاعت قبول کرلینی چاہئے، اس پہ فرعون نے جس

کے دماغ میں حاکمیت کی بُو تھی، کہا، کہ ہم جو ہماری محکومی میں ہو اُس کا حکم ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں، چنانچہ اسی خیال کو فرعونی جماعت نے دُہرایا۔

"(آپس میں) کہنے لگے، کیا ہم اپنے ہی طرح کے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔ حالانکہ ان کی قوم ہماری عبودیت و اطاعت و محکومیت اختیار کئے ہوئے ہے؟" (۲۳/۴۷)

اس جواب سے حاکم قوم کی نفسیاتی کیفیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ غالب قوم کی ہر ادا مغلوب قوم کو پسند ہوتی ہے، اور ہوتے ہوتے غالب قوم کا تمدن مغلوب قوم کی معاشرت بن جاتا ہے، حتیٰ کہ مغلوب قوم کے نظریات بھی وہی کچھ ہو جاتے ہیں جو حاکم قوم کے نزدیک قابل ستائش ہوں۔ اور حاکم قوم کے ذہن میں یہ بات آہی نہیں سکتی کہ مغلوب قوم بھی اس کی اہل ہو کہ وہ کوئی معقول بات کرے۔ اور یہ درست بھی ہے کہ غلام قوم کا اعتماد ہی نہیں ہوتا:

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

جادوئے سامری

حضرت موسیٰ علیہ السلام خلوت گزینی کی خاطر طور کی چوٹیوں پہ تشریف لے گئے اور حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لئے چھوڑ گئے۔ حضرت موسیٰ کے ساتھ سیمری (سامری) قوم کا ایک آدمی بھی تھا۔ یہ شخص بظاہر ایمان لے آیا تھا لیکن اس کے سینے میں ہنوز بتکدے موجود تھے۔ حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی سے اُس نے فائدہ اُٹھایا، اور لوگوں سے سونے چاندی کے زیورات لے کر ایک بچھڑے کا بُت بنایا کیونکہ یہ قوم گائے کی پرستش کیا کرتی تھی۔ اس شخص نے بچھڑے کے پیٹ میں ایک ایسی کلار رکھ دی جو ہوا کے زور سے آوازیں دیتی تھی۔ اس سامری نے اس بچھڑے کو دیوتا مشہور کر دیا۔ لوگ جوق در جوق جمع ہوئے اور اُس کی کرامات پر ایمان لے آئے، اور فوراً ہی حضرت موسیٰ سے پھر گئے۔ حضرت موسیٰؑ کی ایک عمر کی محنت شاقہ نے جو بُت اُن کے قلب و دماغ سے نکالا تھا وہ سامری کے ایک جادو سے پھر داخل ہو گیا۔

غلامی میں پرورش پانے والی قوم پھر غلامی کی طرف لوٹ گئی:

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی



قلب و دماغ

وہ لوگ جن کے قلوب ایمان کے نور سے منور نہیں ہو سکے صرف دماغ تک رسائی ہو سکی ہے، اُن میں یقینِ محکم پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ حضرت موسیٰ کے حلقے میں بھی موجود تھے۔ جو انہیں دوبارہ بت تراشی و بت پرستی کی ترغیب دے رہے تھے کبھی گوسالہ پرستی کی درخواست گذارتے تھے۔ کبھی خدا کو آنکھوں سے دیکھنے کی ضد کرتے۔ یہ حالت صرف محکوم قوم کے افراد کی ہے۔ اس کے برعکس ایک آزاد قوم کے افراد تھے حالانکہ ایک عمر کفر میں بسر کی، لیکن جونہی حضرت موسیٰ کو صاحبِ ایمان دیکھا اور حق و صداقت کی روشنی نظر آئی پروانوں کی طرح اس شمع وحدت پر جمع ہو گئے۔ اور پھر اپنے ایمان پر اس انداز سے جم کر کھڑے ہوئے کہ فرعون کی کوئی طاقت، کوئی دھمکی کوئی آواز انہیں ایک انچ نہ ہٹا سکی۔ یہ خودیِ محکم کا اعجاز ہے۔ محکوم قوم کا سینہ نورِ خودی سے منور نہیں ہوتا بلکہ وہ عقل کے تابع ہوتے ہیں:-

آزاد کی اِک آن ہے محکوم کا اِک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر
محکوم کا اندیشہ گرفتار خرافات

ہمارا ماضی

مسلمانوں کے ماضی (دورِ عمل) پر نظر ڈالیے، جب ان کی نگاہوں سے قوموں کی تقدیریں بدل جایا کرتی تھیں، اُس وقت اُن میں نظری مباحث دکھائی نہیں دیتی تھی، ان کی قوتیں منطقی موشگافیوں اور فلسفیانہ نکتہ آرائیوں میں صرف نہیں ہورہی تھی، ان کے الفاظ گورکھ دھندوں کی طرح اُلجھے ہوئے نہیں تھے کہ عمل کی طرف کوئی قدم نہ اُٹھتا۔ اس قوم میں شاعری نہیں تھی بلکہ —— شمشیر وسناں اوّل، طاؤس و رباب آخر کی داستانیں تھیں۔ لیکن جب یہ دور ختم ہوگیا تو پھر زندگی کے ہر شعبے میں شاعری شروع ہو گئی۔ عمل کی بجائے

نظری مسائل میں اُلجھ کر رہ گئے۔

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جُدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدہ میں نجات

مصریوں کی دیکھا دیکھی حضرت موسیٰ کی قوم میں بھی باطل پرستی کے عقائد آ گئے تھے۔ اُسے ختم کرنے کے لئے حکم ہوا کہ گائے کی قربانی کرو۔ یہ حکم سُن کر لوگوں نے حجت کی اور پوچھا کہ یہ کیسا حکم ہے کیا تم ہم سے تمسخر تو نہیں کر رہے! حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ اللہ کے حکم کی تبلیغ میں تمسخر نہیں کر سکتا۔ پھر اُنھوں نے حجت کی اور کہا کہ تم اپنے حکم دینے والے خدا سے پوچھو کہ گائے کا رنگ کیسا ہو؟ جواب دیا کہ اُس کا رنگ زرد گہرا زرد ایسا کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ جب رنگ کی خصوصیت بھی متعین ہو چکی تو پھر حجت کی اور کہا کہ ہمیں تو جانور کی پہچان مشکل ہے ذرا اپنے خدا سے اس کی وضاحت کروا دو۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ ایسی گائے جو نہ کبھی

ہل میں جوتی ہو نہ کبھی آبپاشی کے لیئے کام میں لائی گئی ہو نہ اُس پر کوئی داغ دھبہ ہو۔ اس جواب پر جب وہ مزید سوال نہ کر سکے تو تعمیل کے لیئے عاجز آ گئے اور مجبوراً ایک گائے ذبح کی حالانکہ وہ کرنا نہیں چاہتے تھے ان سوالات سے مفہوم یہ نہیں کہ حکم سمجھ میں نہیں آیا تھا بلکہ وہ حجت سے ٹالنا چاہتے تھے تاکہ گوسالہ پرستش قائم رہے۔

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

زوالِ یہود

حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت میں بنی اسرائیل کا اوج کمال پر تھا۔ اُن کی شوکت و ثروت عروج پر تھی۔ بیت المقدس کے ہیکل کی تعمیر اسی زمانہ میں ہوئی، لیکن اس کے بعد اُن کے زوال کے اسباب شروع ہو گئے۔ قوت و دولت کا غلط استعمال اُن کی تباہی کا موجب بنا۔ پھر یہ قوم کبھی اہل بابل کی تاخت و تاراج کی آماجگاہ بنی کبھی ایرانیوں کی غلامی میں پھنسی، کبھی رومیوں کی محکومیت اختیار کی، اور اس وسیع زمین پر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آوارہ جھونکوں کی طرح پھرتی رہی، جہاں

پہنچی دھکّے ملے، یہ سب اس لئے کہ قوانینِ الٰہیہ سے منہ موڑ لیا تھا۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

تاریخ نے یہ بات بے نقاب کر دی کہ جب تک قوم کی نگاہوں کا رُخ نہ بدلے اُن کا ذہن نہیں بدل سکتا۔ ذہن کے بدلنے سے قومی تعلیم کے رُخ بدل جاتے ہیں، اور تعلیم بدل جانے سے دل بدل جاتے ہیں۔ اور جب تک دل نہ بدلیں خیالاتِ انسانی، اور شعورِ انسانی پر کوئی پیغمبری اثر پذیر نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کے آئینے میں اُتر کر ذرا اپنی موجودہ تاریخ دیکھئے کہ برسوں سے ہندوستان میں آزادیِ وطن کی تحریک سرگرمِ عمل تھی لیکن عوام اس سے محض کھیل رہے تھے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ کانگریس میں کوئی ایسا قائد نہ پیدا ہوا جس نے دل بدلنے کی کوشش کی ہو۔ مگر ہمارے قائدِاعظمؒ اُٹھے اور صرف سات برس میں مردہ قوم کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو کھینچ کر ساحلِ آزادی تک لے آئے۔ اگر اُن میں یہ صلاحیت نہ ہوتی تو ہماری قوم بھی مصریوں کی طرح حضرت موسیٰ کے حضور میں ہزار حجّتیں پیش کرتیں۔

سخت باریک ہیں امراضِ اُمم کے اسباب
کھول کر کہیئے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی

دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی
ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم الٰہی

ہجوم بحث

یہود نے کتاب اللہ کو الگ رکھ دیا تھا اور باہمی اختلافات کو ختم کرنے کے لیئے اُن کے ہر گروہ کے عالم اور شیخ نے ایک کتاب لکھدی، اور پیامِ خداوندی کی طرف رجوع کرنے کی بجائے وہ لوگ اپنے علماء اور مشائخ کی وضع کردہ شریعت کو عین دین سمجھنے لگے۔ یہی اُن کی بربادی کا سبب تھا۔ ان علماء کی حالت یہ تھی کہ کتاب اللہ کی سیدھی سی تعلیم کی جگہ لفظی مناظروں اور مباحثوں میں اُلجھ کر کتابیں تصنیف کرتے چلے جاتے تھے۔ قرآن کریم میں ہے کہ

"اور دیکھو ان لوگوں کی مثال جو تورات کے حامل کہلاتے ہیں، مگر اس کے احکام پر عمل نہیں کرتے۔ اس گدھے جیسی مثال ہے جو (بڑی بڑی کتابیں اپنی پشت پر) لادے ہوئے ہو۔ کیسی بُری مثال ہے ان لوگوں

کی جو اللہ کے احکام کے متعلق آیات کو جھٹلاتے ہیں۔ اور یاد رکھو۔ خدا نافرمان لوگوں کو کبھی سیدھی راہ نہیں دکھایا کرتا کہ یہی اس کا قانون ہے۔" (۶۲ / ۵)

پیٹھ پر پشتارہ اور عملی زندگی معیارِ انسانیت سے گری ہوئی:

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے مجازی کا

گرفت و رحمت

اللہ تعالےٰ انسانوں کو بُرے اعمال کی سزا بھی دیتا ہے اور جسے چاہے بخشش بھی دیتا ہے۔ سزا و جزا اُس کی رحمت پر منحصر ہے حضرت یونس علیہ السلام کے قصّہ میں ایک نمایاں واقعہ آتا ہے:

"پس (جہاز کے) مسافروں کے ساتھ یہ بھی شریک ہو گئے۔ چنانچہ یہ اُن لوگوں میں ہو گئے جو سمندر میں ڈال دیئے گئے۔ پھر ایک مچھلی نے اُن کو (حضرت یونس کو) نگل لیا، اور وہ اپنے آپ کو اُس وقت ملامت کر رہے تھے۔" (۳۷ / ۱۴۲)

اللہ کی طرف سے اُنھیں یہ سزا ملی تھی کہ اُنھیں مچھلی کے پیٹ میں رکھا گیا۔ اس کے بعد بحکم خدا مچھلی نے ساحل پر آ کر اُگل دیا۔ پھر اُنھیں نینوا کے باشندوں

کو اُن کے بداعمال کے نتائج کی آگاہی کے لئے بھیجا، چنانچہ آپ وہاں تشریف لے گئے۔ یہ باشندے اُن پر ایمان لے آئے اور خدا نے اُن پر عذاب کے بدلے رحمت نازل کی۔ دیکھا جائے تو حضرت یونس علیہ السلام کو دوبارہ زندگی عطا ہوئی تھی، ورنہ ایک بار تو وہ ختم ہو ہی چکے تھے۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

مناظرے

آجکل خدا جانے لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ مباحثوں اور مناظروں کے وہ دلکش مناظر ہی نظروں سے غائب ہو گئے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ اِدھر کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا اُدھر دوسرے نے خدا کا دعویٰ دائر کر دیا اب دونوں پارٹیاں میدان میں اُتر آئیں، اور ایک تیسری پارٹی جو ان دونوں کو لادین سمجھتی تھی وہ کبھی اُس کا ساتھ دیتی ہے تو کبھی اُس کا۔ دونوں طرف سے مولوی صاحبان آجاتے۔ خوب موٹے تازے، ہٹے کٹے، اور مضبوط

ڈنڈے ہاتھ میں لئے اسٹیج پر آتے جن کے آنے سے فضا نعروں سے گونج اُٹھتی۔ رات رات بھر ایک دوسرے کو جھوٹا اور ملعون ثابت کرنے کی کوششیں جاری رہتیں، گالیاں تک سُنائی جاتی تھیں، اور صبح دونوں پارٹیاں اپنے اپنے دعوے پر اکڑ اکڑ کر باتیں کرتی تھیں کہ ہم نے کل رات بحث میں میدان مارا۔ اور ہمارے مولوی صاحب نے اُس مولوی کو مناظرہ میں چت گرالیا۔ یہ تھیں وہ باتیں جو ہمارے مولویوں کی وجہ سے ہوا کرتی تھیں اور آسمان ان پر ہنسا کرتا کہ:

وائے نادانی قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو
اِس سرابِ رنگ و بُو کو گلستاں سمجھا ہے تو

شاخِ نازک

جس طرح ایک حکیم مریض کی نبض دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ یہ مریض فلاں مرض میں مبتلا ہے اور اب اس کا علاج یہ ہے، اور اگر اُس نے صحیح علاج نہ کیا تو اُس کے یہ نتائج برآمد ہوں گے۔ چنانچہ حکیم کا ایک ایک لفظ صحیح نکلتا ہے۔ کیا حکیم کو الہام ہوا تھا یا اُس پر وحی نازل ہوتی تھی؟ نہیں بلکہ اُس نے اٹل قوانین کے ماتحت فیصلہ کر کے باتیں بتا دی تھیں۔ یہی کیفیت

انسانی حیات اجتماعیہ کے قوانین کی ہے۔ جس شخص کی نگاہ ان قوانین پر ہے وہ کسی قوم کی موجودہ روش سے بتا سکتا ہے کہ اس قوم کا انجام کیا ہوگا۔ اور چونکہ یہ اٹل قوانین قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ چنانچہ جس کی نظر قرآن کے اندر پہنچ کر نور حاصل کر لیتی ہے وہ اس کی روشنی میں آنے والے حالات کو سہولت سے دیکھ سکتا ہے۔ اور پورے یقین کے ساتھ پکار اٹھتا ہے کہ اے جھوٹی تہذیب کا فریب کھانے والو:-

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا استوار ہوگا

ایمان و قوت

آج کسی ملک یا قوم کی قوت کا دار و مدار صرف دو باتوں پر رہ گیا ہے سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ گنتی میں کس قدر ہے، افراد کے سروں کو گنا جاتا ہے بلکہ ہاتھوں کو جبکہ کسی قوت کو تسلیم کروانا ہوتا ہے تو مجلس سے ووٹ (رائے) لئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اسلحہ کی مقدار کو دیکھا جاتا ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں واقعی اس معیار کے لئے درست، مناسب اور بجا ہیں تو بتائیے کہ جب حضرت رسول اللہ کو مکہ کے گرد و نواح

کے لوگوں کی ہدایت کا حکم ہوا تو اُس وقت آنحضرت کی جماعت میں کتنے افراد تھے؟ کل چالیس افراد کی جماعت تھی، آج شاید گنتی کے چالیس آدمیوں کو جماعت کا نام بھی نہ دیا جا سکے۔ لیکن وہ آدمی نہیں تھے بلکہ ایمان کی چالیس قوتیں تھیں، اُن چالیس مقدس پیکروں کے سینے میں جو قلب متحرک تھے ان کی دھڑکنوں میں کتنی قیامتیں چھپی ہوئی تھیں۔ اُس وقت قوتوں کا مقیاس ایمان کی حرارت تھی، اور اس حرارت کے سامنے بڑی سے بڑی قوت بھی نہیں ٹھہر سکتی۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

بے یقینی

قوموں کی موت و حیات کا مدار اُن کی قوتِ ایمان پر ہے۔ اگر انھیں اپنے مسلکِ حیات کی صداقت پر یقین ہے اور وہ یقین دماغ تک نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انھیں ان کے مقام سے نیچے نہیں گرا سکتی۔ لیکن جہاں ان کے یقین کی قوت کمزور ہوتی ہے۔ موت کا پنجہ انھیں فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہے

ہم آج کے مسلمان جن کا شمار صرف مردم شماری کے رجسٹر میں ہے، کیا سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمان قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ مسلمان کی قوتوں کے سامنے پہاڑ بھی کانپتے ہیں، وہ راز ہمیں کون بتائے کہ

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقین اللہ مستی خود گزینی
سُن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

حسب و نسب

ملوکیت قرآن کی رُو سے اس لیے ناجائز ہے کہ اس میں حقوق و مفاد کی اجارہ داری، موروثی۔ نسلی استحقاق کی بنا پر ہوتی ہے۔ نبی اکرمؐ اسی غلط معیارِ استحقاق کو ختم کرنے کے لئے اُٹھے اور تمام عمر اسی غلط معیار کو مٹانے اور اس کی جگہ قرآنی معیار قائم کرنے کی سعی فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ حضورؐ نے وفات سے کچھ عرصہ پہلے رومیوں کی طرف جس فوج کا بھیجنا تجویز کیا، اس کی سرداری حضرت اسامہ بن زیدؓ کو عطا فرمائی چونکہ حضرت اسامہؓ ایک غلام زادہ تھے۔ اس لئے بعض منافقین نے اس پہ

اعتراض کیا تو حضور نے فرمایا کہ:

"اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ کی سرداری پر بھی تم معترض تھے، خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا"

اس کے علاوہ حضورؐ نے وفات سے پہلے آخری خطبہ ارشاد فرمایا اس کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ:

"اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہؓ، اور اے پیغمبر کی پھوپھی صفیہؓ خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تمھیں خدا سے نہیں بچا سکتا"

پہلی مثال سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کوئی رتبہ نسل پر یا مخصوص نسل کے لئے مخصوص نہیں ہو سکتا۔ ہر قابل آدمی کا حق ہے کہ اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مطابق آگے بڑھے۔ اگر ایک غلام کا بیٹا جوہر ذاتی کی بنا پر کسی اونچے مرتبے کے لائق ہے تو اُسے ملنا چاہیئے اور دوسروں کو اُس کی سرداری قبول کرنی پڑے گی جو نسل کے اعتبار سے اُس سے بہت اونچے ہی کیوں نہ ہوں، اور دوسری طرف یہ کہ خدا کی میزان میں اصل وزن عمل کا ہے، حسب و نسب یا تعلقات کا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ پیغمبر کی بیٹی بھی معیار خداوندی سے مستثنےٰ نہیں ہے۔ جو لوگ حسب و نسب کو مقدم رکھتے ہیں وہ درحقیقت اسلام کے خلاف ایک زہریلا پروپیگنڈا کرتے ہیں، اور یہ بہت بڑی سازش ہے، جس کے

اثرات اسلامی تعلیم و تصورات کو کائنات کے گوشے گوشے میں ذلیل کر دیں گے
اور تاریخ شاہد ہے کہ انہی تصورات نے روحِ اسلامی کو ضعف پہنچایا ہے۔ برہمنوں
کی طرح یہاں بھی ہر سیّد کو واجب الاحترام سمجھا جاتا ہے خواہ اس کے
اعمال خلافِ قرآن ہی کیوں نہ ہوں۔ ان تصورات کے صدقے میں اسلام
اور ملتِ اسلامیہ مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہوا یہ کہ یہی گروہ ذاتیں بن
گئیں، اور یہی ذاتیں اونچے نیچے طبقات میں منقسم ہو گئیں۔ اور اس طرح
اسلام رفتہ رفتہ اُس عہدِ جاہلیت میں جا پہنچا جہاں سے اسلام نے
کفارِ عرب کو نکالا تھا۔ انگریز کی حکومت نے یہ شگن مبارک سمجھا، اور
اسی خصوصیت کے ساتھ فوج، پولیس، اور دوسرے محکموں میں جگہیں
مخصوص کر دیں۔ بلکہ اس نے تو جماعتوں کے علاوہ زمین کو بھی اسی نظریہ کے
ماتحت تقسیم کر دیا، اور بنگال کے مسلمان کو فوجی خدمات کے ناقابل سمجھکر
ناکارہ بنا دیا۔ آج بھی جبکہ ہماری اپنی حکومت قائم ہو گئی ہے، جسے مسلسل
تین برس سے اسلامی حکومت کہا جا رہا ہے، یہی چیز نمایاں اور پیش
پیش ہے۔ صوبہ بندیاں سختی سے قائم ہیں اور صوبہ کا تناسب بھی قائم،
ذات پات کی تخصیص بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے، اور اقربا پروری کا دور
بھی عروج پر ہے۔ اگر ان چیزوں کے خلاف کوئی آواز اُٹھائے اُس پر
سخت نگرانی ہوتی ہے بلکہ وہ منکرِ حدیث کہلایا جاتا ہے۔ پھر انہیں

اسبابِ زوال کون بتائے؟

خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

عناصرِ مومن

قرآن کریم نے مومنین کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

"بلاشبہ آسمان اور زمین کی خلقت میں اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہتے ہیں اربابِ دانش (مومنین) کے لئے (معرفت حق کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔" (۳ / ۱۹۰—۱۹۱)

جہاں تک تنہا علم کا تعلق ہے وہ عقل تک محدود ہے اس سے صرف ذہنی بصیرت حاصل ہوتی ہے قلبی تسکین نہیں، اس کے بعد تنہا عمل ہے، اس سے قلبی سکون تو مل جاتا ہے لیکن دوسروں پر کسی شئے کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن تیسرا طریقہ علم و عمل کا ہے جس سے ذہن جلا پا کر آگہی بھی ہوتی ہے اور سعی و عمل سے سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ یہ قرآنی طریق تربیت ہے، جس کا ماحصل مردِ مومن ہوتا ہے:۔

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حُسنِ طبیعت۔ عرب کا سوزِ دروں

اِس حقیقت کو ان الفاظ میں نمایاں کیا ہے:

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ

مرکزیّت

آپ پرکار سے دائرہ بنائیں، اور پھر پرکار کی نوک مرکزی نقطہ سے ہٹا کر کسی دوسرے نقطہ پر رکھکر دائرہ مکمل کرنے کی کوشش کیجئے۔ عمر بھر کوشش کرتے رہیئے، دائرہ کی ماہیت و صورت کبھی درست نہیں ہو سکیگی تا وقتیکہ نوک کو پھر پہلے مرکزی نقطہ پر نہ لایا جائے۔ یہی کیفیت اصولِ دین اور دائرۂ ملت کی ہے۔ پرکار کو اصولِ دین تصوّر کر لیجئے اور دائرہ کو حیاتِ اجتماعیہ (حیاتِ ملّی) اور پھر اسی اصول پر غور فرمایئے کہ کیا اصول کو اپنی جگہ سے ہٹا کر حیاتِ اجتماعیہ کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ نہیں — کیونکہ قوموں کی ہستی کا مدار اُن کی مرکزیت پر رہتا ہے، ان کی جداگانہ حیثیت اور امتیازی خصوصیت اسی نقطہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر ان کی مرکزیت میں خلل واقع

ہو جائے تو ان کی ملّی حیثیت کا سارا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔ قوموں کا خصوصی امتیاز ان کا اندازِ فکر ہے جو ان کی معاشرت کا لباس پہن کر دنیا کے سامنے آتا ہے۔ اور اس معاشرت کی نگراں قومی سطوت و قوت ہوتی ہے دنیا میں کسی قوم کی تہذیب زندہ و سلامت نہیں رہ سکتی جب تک کہ اُس کی پشت پر قوت و اقتدارِ حکومت نہ ہو۔ قوت کا دوسرا نام مرکز ہے جسے دارالسلطنت کہتے ہیں۔ قوموں کی بقا و فنا میں سب سے زیادہ ہاتھ اس دارالسلطنت کا رہا ہے۔ بڑی سے بڑی حکومت کو فتح کرنے کے لئے صرف اس کے دارالسلطنت کو فتح کر لینا کافی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی مرکز سے ساری سلطنت کے تار و پود کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ شہر بھی دوسرے شہروں کی طرح اینٹ پتھر سے بنا ہوتا ہے۔ ہر شہر ہر بستی جو دائرہ کے اندر ہے، اسی ایک قانون حکومت کے ماتحت سانس لے رہی ہوتی ہے لیکن اس ایک شہر (دارالخلافہ) کی شکست سے تمام کا تمام علاقہ غیر شعوری طور پر شکست تسلیم کر لیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس مرکز سے ایک احساس وابستہ ہوتا ہے جب تک اس احساس کا رشتہ نہیں کٹتا حیاتِ اجتماعیہ کا نظام برقرار رہتا ہے۔ جس طرح فضا میں گم ہو جانے کے باوجود پرندے کی نگاہیں اپنے آشیان پر رہتی ہیں، لیکن جونہی مرکزی تعلق ختم ہوا باوجود ایک دائرہ میں رہنے کے تمام ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں جس طرح ہوا کا

جھونکا آنے سے صحرا کے ریت کے ذرّے۔ جب تک پتنگ کا رشتہ ڈور سے قائم ہے لاکھ آندھی آجائے فضا میں طوفان آجائیں یہ الگ نہیں ہو سکتی۔ لیکن ڈور کے ٹوٹ جانے سے فضا ساکت ہی کیوں نہ ہو، پتنگ آوارہ ہو جاتی ہے اور ایک ہلکی سی ہوا اُس کا رُخ بدل دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ع

"موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں"

یہ ایک قانون ہے جو حسب ونسب اور رنگ ونسل میں تمیز نہیں کرتا۔ لیکن قوم مسلم کے لیے یہی قانون ذرا مختلف اور مخصوص ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کا فیصلہ ہے کہ دین صرف دین اسلام ہے باقی کوئی دین نہیں ہے۔ دین اسلام کے علاوہ تمام گروہ بندیاں ہیں جو اللہ کو پسند نہیں۔ لہٰذا وہ اس دین کو مان لینے والوں کے لئے یہ قانون قانونِ الٰہی بن جاتا ہے۔ یہی قانون اور یہی خصوصیت ملتِ اسلامیہ کو دیگر اقوامِ عالم سے ممتاز کرتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

"مسلمانو! اگر تم اپنے آپ کو قوانین خداوندی کی محافظت میں رکھو تو وہ تمہارے لئے (حق و باطل میں) امتیاز کرنے والی ایک قوت پیدا کر دیگا اور تم سے تمہاری بُرائیاں دُور کر دے گا۔ اور کوتاہیوں کو ڈھانپ دیگا اللہ بڑا فضل کرنے والا ہے۔" (۸/۲۹)

خدا کے قوانین خدا کی حاکمیت کے دستور ہیں اور یہی مسلمان کا

نصب العین ہے۔ اور ان قوانینِ خداوندی کا نفاذ قوت و سطوت کے بغیر ناممکن ہے۔ یوں سمجھیئے کہ حکومتِ الٰہیہ کے لئے پہلے حکومتِ اسلامیہ کا وجود لازم ہے۔ مرکزِ اسلامیہ کی تعمیر کا حکم حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کو ملا چنانچہ آپ نے سب سے پہلا مرکز تعمیر کیا، اور یہی کعبہ کی عمارت کا سنگِ بنیاد تھا۔ اور یہی کعبہ تمام نوعِ انسانی کے لئے مرکزِ امن و سلامتی قرار پا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس کی شانِ مرکزیت کے متعلق ارشاد ہے کہ:

"اور (پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (مکے کے) اس گھر کو انسانوں کی گرد آوری کا مرکز اور امن و حرمت کا مقام ٹھہرایا اور حکم دیا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے کی جگہ (ہمیشہ کے لئے) نماز کی جگہ بنالی جائے۔ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو حکم دیا تھا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے، اسے طواف کرنے والوں، عبادت کے لئے ٹھہرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے (ہمیشہ) پاک رکھنا (اور غیر خداوندی نظام کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرنا)"

سورۃ بقر ($\frac{2}{125}$)

پھر اسی پہلے گھر سے اذان بلند ہوئی جسے سُن کر افلاک لرز گئے لیکن آج وہ گھر تو موجود ہے لیکن گھر والے گھر کے اندر نہیں ہیں بلکہ اپنے مرکز سے الگ

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک

کس طرح ہوا کند تیرا نشتر تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟

زوال کے اسباب کی وجہ صرف اتنی سی ہے کہ وہ عزت چھن گئی عزت کی ضد ذلت ہے۔ اور ذلت کا نام محکومیت ہے، لہذا عزت کا نام حاکمیت ٹھہرا۔ وہ حاکمیت اسی وقت تک ہمارے مقدرات میں تھی جب تک ہم نے اپنا رشتہ اپنے مرکز سے قائم کر رکھا تھا وہ مرکز جس کے متعلق خدا نے فرمایا ہے۔

"بلاشبہ پہلا گھر جو نوع انسانی کے لئے حکومت الٰہیہ کا مرکز بنایا گیا ہے وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا، اور تمام انسانوں کے لئے سرچشمہ ہدایت، اس میں دین حق کی روشن نشانیاں ہیں۔ ازاں جملہ مقام ابراہیم ہے (یعنی ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے اور عبادت کرنے کی جگہ جو اس وقت سے لیکر آج تک بغیر کسی شک و شبہ کے مشہور و متعین رہی ہے۔ اور ازاں جملہ یہ بات ہے کہ) جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن و حفاظت میں آگیا"   سورۃ آل عمران (۹۶-۹۷)

یہ ہے وہ امن وہ سلامتی کی جگہ جس کی حدود میں داخل ہو کر شرفِ انسانیت کے نیاز حاصل ہو جاتے ہیں۔ آج مسلمان بلکہ دنیا کا ہر انسان جستجو میں ہے کہ اس لمبی چوڑی دنیا میں کہیں کوئی گوشہ عافیت کا مل جائے۔ جہاں پہنچ کر درندہ صفت انسانوں کے استبداد سے نجات مل سکے۔ یاد رکھیئے یہ مقام نظام توحید کے مرکز کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مقام ہے جو شرفِ انسانیت کا محافظ ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی اس مقام کی حدود میں آجائے امن حاصل کرے گا۔ مطلب یہ کہ جو کوئی نظام الٰہیہ کو تسلیم کرکے اور ایمان لاکر قوانین خداوندی کے ماتحت آجائے اُسے از روئے اسلام سلامتی مل جائے گی۔ اسی لئے اس مرکز کو ساری دنیا کے امن کا مرکز کہا گیا ہے۔

مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

رسمِ کعبہ

جس کعبہ کو خدا نے امن و سلامتی کا مرکز کہا ہے آج اُس قبلہ کی حیثیت ہمارے نزدیک کیا رہ گئی ہے؟ کیا اسی حد تک نہیں کہ صرف اُسکی طرف مُنہ کرکے نماز پڑھ لی جائے یا زیادہ سے زیادہ حج کی رسم ادا کرکے واپس لوٹ آئیں اور وہاں سے آب زمزم یا کھجوریں کے علاوہ کچھ نہ لائیں۔ حالانکہ قرآن

نے یہ بتایا تھا کہ توحید سے مقصود یہ ہے کہ خدائے واحد کی حاکمیت قبول کرنے والوں میں وحدت ملی پیدا ہو۔ اور وہی شے ہمارے اندر مفقود ہے۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری
ابتک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں
نے گرمی افکار نہ اندیشۂ بے باک!

حشر و نشر کا معیار یہ تھا کہ ہر قوم کے اعمال اسی میزان پر آکر تلتے تھے مسلمانوں کے اس مقام کا راز حرم کی تقویت میں مضمر تھا۔ آب زمزم کو اس لئے مقدس کیا گیا تھا کہ اس کی زندگی کی کھیتی اس پانی سے سیراب ہوتی تھی لیکن صد افسوس کہ وہ پانی اب تبرک بن کر رہ گیا ہے اور لوگوں کی نگاہ میں ایک ... سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے تقدس سے مقصد یہ تھا کہ یہ مرکز اس قدر مضبوط ہو کہ ساری دنیا اور اقوام عالم اپنے تنازعات لے کر اس کی طرف رجوع کریں۔ اور یہاں کا فیصلہ تمام فیصلوں پر غالب رہتا۔ اور مومن کے فیصلے فطرت کے فیصلے ہوتے۔

فطرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان۔ قیامت میں بھی میزان

بنیاد و اصول

جب تک سیاست اور مذہب میں یکرنگی رہیگی اس ہم آہنگی کا نام دین ہوگا۔ جونہی اس سے سیاست الگ کرلیں دین منقسم ہوجائے گا یعنی پرستش خدا کی اور محکومیت انسانوں کی۔ اس شرک سے متنبہ کیا گیا تھا۔

اے پیغمبر اسلام۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر اس نظام زندگی (الدین) کی طرف اپنا رُخ پھیرلو جو اس فطرت خداوندی کے عین مطابق ہے۔ جس پر خدا نے تمام نوع انسانی کو پیدا کیا ہے (یاد رکھو) خدا کی تخلیق میں کوئی کمی نہیں ہوا کرتی۔ یہی صحیح نظام ہے۔ لیکن اکثر لوگ واقف نہیں ہیں۔

سورۂ روم (۳۰/۳۰)

مسلمانوں میں سب سے پہلے تفریق دین کی تقسیم سے شروع ہوئی۔ ملوکیت کا زمانہ آیا۔ خلافت کا دور ختم کردیا گیا۔ خلیفۂ وقت نے اپنا نام شہنشاہ وقت رکھا۔ اور اپنی شہنشاہیت کو بچانے کے لئے مذہبی پیروؤں سے جوڑ میل کیا۔ مذہبی پیرو شہنشاہوں کا قرب حاصل کر کے خوش ہو گئے۔ ان شہنشاہوں نے سیاست کا نام سلطنت رکھا اور اُسے اپنے لئے مخصوص کرلیا۔ اور دین کا نام مذہب رکھکر مذہبی پیروؤں کے سپرد کردیا۔ ان پیروؤں نے سلطنت کی حفاظت و بقا کے لئے نظام خداوندی کے سیدھے سادے اصولوں کو

اُلجھا دیا، پھر کتاب اللہ کو طاق میں رکھکر ذہنی مسائل کا ایک سلسلہ شروع کر کے کتابوں کی تصنیف میں مشغول ہو گئے۔ آخر کار یہی کتابیں مستقل طور پر دینی علوم بن کر رہ گئیں۔ ہر کتاب (خیال) کو ماننے والا ایک الگ گروہ پیدا کیا گیا۔ اس طرح ملت کو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ اور مرکز سے اس طرح الگ کیا گیا کہ انھیں اس کا احساس تک نہ ہوا۔ دین اسلام کی اصل صورت بگاڑ کر دنیا کے سامنے پیش کی گئی۔ دنیا نے ان کا مذاق اڑایا اور یہاں سے تنزل شروع ہوا۔ یہی وہ دین و سیاست کی تفریق تھی جس سے پھر فساد رونما ہوئے حالانکہ حضور اکرم ایسی شرک و فساد کو مٹانے کے لئے تشریف لائے تھے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

قرآن اور شمشیر

انسانی فطرت بالخصوص اور فطرت بالعموم کوئی ایسا قانون تسلیم نہیں کرتی، جبتک قانون کے ہاتھ میں قوت و اقتدار کی شمشیر جوہر دار نہ ہو۔ قانون بلا قوت صرف مباحثوں اور مناظروں کا منطقی کھیل بن کر رہ جاتا ہے۔ قانون عملاً اُس وقت نافذ نہ ہوگا، جب تک حکومت کو اقتدار حاصل نہ ہوگا۔ قرآن نے اس قوت و اقتدار کو استخلاف کہا ہے:۔

"اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جنھوں نے ایمان قبول کیا اور وراثت ارضی کی صلاحیت پیدا کرنے والے اعمال کئے۔ یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم ضرور بالضرور انھیں دنیا میں قوت و عظمت کا مالک بنا دینگے جس طرح ہم نے ان سے پہلوں کو قوت و شوکت عطا فرمائی تھی۔ اور ایہ وعدہ کیا ہے کہ بلاشبہ خدا اس دین کو ان کے لئے متمکن و صاحب اقتدار

بنا دے گا۔ جسے خدا نے ان کے لئے پسند فرما لیا ہے۔ اور نیز ان پر خوف و زندگی کے بعد ان کی زندگی کو امن و سلامتی کی زندگی میں تبدیل کر دے گا۔ کیونکہ وہ لوگ میری ہی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرتے ہیں۔ اور میرے ساتھ (میری اطاعت و محکومیت میں) کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے۔ اور جس نے ان تمام باتوں کے باوجود انکار کی راہ اختیار کی۔ تو درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جو فسق و فجور پھیلانے والے ہیں۔" (۲۴/۵۵)

گویا دین اُس اقتدار کا نام ہے جس میں محکومیت صرف خدا کی اختیار کی جائے، کسی انسان کی اطاعت قبول نہ کی جائے اور نہ ہی کوئی انسان کسی قوت سے دوسرے انسانوں کو اپنے اقتدار کے سامنے جھکانے کا مجاز رکھتا ہے۔ یعنی خدا کی حاکمیت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اس طرح دنیا میں قانونِ قرآنی کا نفوذ ہو گا۔ اور اس سے قرآن اور شمشیر میں ہم آہنگی ہو گی۔ یہی وہ قوت و اقتدارِ دین ہے جس کے بارے میں اللہ نے سورۃ الانفال میں فرمایا ہے: کہ

"اور جس قدر ان کے مقابلے میں تمہارے بس میں قوت ہے پیدا کر کے اور گھوڑے تیار کر کے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو۔ اس طرح تیار رہ کر تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رہو گے۔" (بجم)

یہ جماعتِ مومنین، خدا کا لشکر، قانونِ خداوندی کے نافذ کرنے والے دنیا میں بھلائی پھیلانے والے۔ فتنہ و فساد کو روکنے والے، نشۂ قوت میں بدمست نہ ہونے والے ہیں۔ اس لئے کہ قوت و اقتدار کے ساتھ بارگاہِ ایزدی میں اپنی جبینوں کو سجدے میں جھکائے رہتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ تو نے ہمیں اس امانت کے لئے ایسا منتخب کیا ہے تو ہمیں اس کی حفاظت کے جوہر بھی عطا فرما۔ کیونکہ ہم اس اقتدار کے مالک نہیں ہیں امین ہیں۔ یہی وہ خدا کا لشکر ہے جو صاحبِ قوت بھی ہیں اور صاحبِ عجز بھی۔ اربابِ بشارت بھی ہیں اور باعثِ رحمت بھی۔ انہی لوگوں کے متعلق خدا نے سورۂ فتح میں فرمایا:۔

"محمد اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ (جماعتِ مومنین میں سے) ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں سخت اور باہم نرم ہیں۔"

اس شدت اور نرمی و سختی کی ضرورت اس لئے ہے کہ اس کے بغیر قانون بے نتیجہ ہو کر رہ جاتا ہے ؎

تمیزِ خار و گل سے آشکارا
نسیمِ صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

دین کی حفاظت کے لیے قوت و اقتدار نہایت ہی ضروری ہے اور جب کہ دوسری قوموں کے پاس ایسی سادہ قوتیں بھی ہیں کہ ایک بم سے دنیا کا ایک حصہ ختم کر دیں اس کے مقابلے میں جب تک مسلمان اس سے غالب قوت حاصل نہ کریں گے دنیا کو دین اسلام کی دعوت دینے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے، اور اس قوت کے ساتھ ساتھ خود کو اسلامی معاشرت میں ڈھالنا بھی اشد ضروری ہے تاکہ دین کا نمونہ پیش کرنے کے لئے اپنے اعمال۔ اخلاق اور کیرکٹر کو پیش کیا جائے۔

اس کیرکٹر کے ساتھ قوت نہایت لازمی ہے، ورنہ دین بالکل مذہب بن کر رہ جائیگا۔ دین مذہب اُس وقت بنتا ہے اور بنا ہے جب علت گروہوں میں منقسم ہو جائے اور جماعتوں کے امام (مولوی) لوگوں کو اپنے ذہنی مسائل میں اُلجھا کر صحیح قرآنی تعلیم سے بہت دُور لے جانے میں کامیاب ہو جائیں۔

گر موجب ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دیں بندۂ مومن کے لئے موت ہے یا خواب

جو قوت اللہ تعالے کے قوانین کی حفاظت کے لئے ہو، وہ دنیا میں کبھی ظالم بن کر استبداد کو رواج نہیں دے سکتی، اس لئے کہ ان کا نصب العین اور فعل صرف اور محض قرآنی نظام قائم کر کے امن و علامتی کو برقرار رکھتا ہے یہ قوت ظالموں کا سر کچلنے کے لئے ظالم بنے گی، اور اس کا یہ ظلم مظلوم کی حمایت

کا دوسرا نام ہوگا۔ سرکشی اور استبداد دنیا میں اُس وقت آتے ہیں جب دین و سیاست منقسم ہوتے ہیں۔

تاریخِ اُمم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحب نظراں، نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و خرد و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
بے دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھکر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

خدا کا یہ نظام جس میں قوت بھی ہے اور حریری بھی نظامِ حکمت اور دینِ فطرت کہلاتا ہے، اور یہ نظامِ فطرتِ انسانی کے تقاضوں کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے، اور تکمیلِ شرفِ انسانیت کا آئینہ دار ہے۔ اس لئے یہ دین ساری کائنات کی سلامتی کا ذمہ دار ہے اور ساری دنیا کا دین ہے۔ اس کے سوا تمام وہ نظام خواہ ایران میں شخصی ہو یا حلقۂ فرنگ میں جمہوریت۔ باطل ہیں۔ اس لئے کہ ان کے اس باطل نظام کی رُو سے انسانوں کو انسانوں پر حکومت کا حق حاصل ہے اور انسان انسانوں کی محکومیت اختیار کر لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہاں فطری آزادی سلب ہو جاتی ہے۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر غالب ثابت کرنے کے لئے تو مناظرے وغیرہ کافی ہو سکتے ہیں، لیکن ایک نظام مملکت کو دوسرے نظام سے بہتر ثابت کرنے کیلئے تو کسی اور ہی شئے کی ضرورت ہے۔

خونِ دل وجگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

نظام مملکت (دین الٰہی) میں منطق و فلسفہ کی لمبی چوڑی کہانیاں کلام و بیان کی قوالیاں۔ ذہنی دلائل کے مناظرے اور غیر فطری تشاہد کے مباحث کام نہیں دیتے۔ یہاں تو صرف وہ قانون کام دیتا ہے جس کے سامنے میں دنیا کو سلامتی ملتی ہے اور عدل قائم ہوتا ہے۔

سوچا بھی ہے اے مرد مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیر جگر دار
اس بیت کا یہ مصرع اول ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

مسیح کی منادی

گیروا رنگ کے لباس میں ملبوس انگریز نسل کے لوگ ہندوستان آتے رہتے ہیں پچھلے گزشتہ سال میں یہاں انکا ایک گروہ کام کر رہا تھا۔ ان کی

رہائش گاہوں پر اور گرجوں کی محرابوں پر "ہنگتی فوج" لکھا ہوتا تھا۔ یہ واقعی ایک فوج تھی، اس کی آستینوں میں ایسے اسلحہ پوشیدہ تھے کہ اگر یہ کسی غیر متعصب قوم میں جاکر اپنا پراپیگنڈہ کرتی تو یقیناً سارا ہندوستان عیسائیت کے حلقے میں آجاتا۔ اس مشن نے مشن کے نام سے کئی اسکول کھولے۔ کئی ہسپتال رائج کیئے۔ اور اس قدر روپیہ بہایا کہ ناشعور قومیں بڑی آسانی سے ان کے دام میں گرفتار ہو جاتیں۔ اس مشن کے پیش نظر صرف اسلام کی اسلامی معاشرت کو ختم کرنا تھا اور بس۔ یہ مسیحی مبلغ ناصحانِ مشفق کے لباس میں جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ یورپ سے چلتے ہیں تو اپنے اسلحہ ساز کارخانوں کو تاکید کر آتے ہیں کہ دیکھنا تمہاری بھٹیاں کہیں سرد نہ پڑ جائیں۔ اور بڑے بڑے دہانے کی توپیں، دنی گولے، ملک بوس طیارے، اور جہاں سوز بم تیار ہوتے رہیں۔ پھر یہی داعظ مشرق میں آکر مسیح کی منادی سناتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہمارا مشن کمزوروں سے رفاقت ہے خدا کی بادشاہت کمزوروں اور ناتوانوں کا حصہ ہے۔ اے لوگو! مقدس باپ کی تعلیم پر عمل کرو۔ جو ایک گال پر طمانچہ مارے تم دوسرا گال اُس کے آگے کردو۔ فکر نہ کرو آسمانی بادشاہت تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ مسیح موعود کا یہی ارشاد ہے، آسمانی روح القدس کا یہی فیصلہ ہے۔ یہ دنیا اور اس دنیا کی حکومت و سطوت، یہ مٹی ہے اور مٹی کا لالچ کرنا ذلت کی نشانی ہے۔ مشن اس قسم کے افسانے سناتا رہتا ہے۔ سیلے انتہا روپیہ خرچ کرنے

کے بعد اس مشن نے یہ تیر مارا کہ بھنگیوں کو عیسائی بنا لیا۔ اور تعداد گن کر اپنے مرکز میں رپورٹیں بھیجتے رہے۔ اس طرح اس مشن نے متاعِ غیر پر نظر رکھی ؎

متاعِ غیر پہ ہوتی جب نظر اس کی
تو ہیں ہراولِ لشکرِ کلیسا کے سفیر

یومِ نجات

ندی کے اس پار جنگل تھا اس میں صرف بھیڑیں رہا کرتی تھیں اور اُس پار ایک جنگل تھا اُس میں صرف شیر رہا کرتے تھے۔ شیر ہر روز ندی پار کر کے بھیڑوں کے جنگل آجاتے اور کسی نہ کسی بھیڑ کو دبوچ کر لے جاتا۔ بھیڑیں ان شیروں کی شیری سے تنگ آگئیں۔ ایک دن مجلسِ مشورت منعقد کی اور شیروں کی نجات کے متعلق سوچنے لگیں، مگر کچھ عقل میں نہ آیا۔ آخر ایک بہت بوڑھی بھیڑ نے کہا میں نے تم ایک ایک کی بات سُنی ہے۔ تم چاہتی ہو کہ تمہارے اندر بھی شیری آجائے تاکہ شیروں کا جم کر مقابلہ کر کے اُنہیں ظلم کا مزہ چکھا سکو۔ لیکن میری بہنوں! یہ تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ تمہاری فطرت میں خوئے شیری نہ آسکے گی۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ شیر کی فطرت بدل جائے

بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

میں کل درویش کے جامے میں جاؤں گی اور پھر دیکھو جو خدا کرے۔ چنانچہ دوسرے روز وہ بوڑھی بھیڑ گیروا لباس پہن کر شیروں کے بادشاہ کے حضور پہونچی۔ شیر نے درویش صورت دیکھکر بڑی تعظیم کی۔ بھیڑ نے نصیحت شروع کی اور کہا۔ بہادروں کے بہادر شیروں کے شہنشاہ! کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ یہ دنیا ایک سرائے ہے۔ یہ کسی کو ہمیشہ نہیں رہتا۔ زندگی پانی کا بلبلا ہے، اُس پر بھروسہ کیا۔ اِس مختصر اور غیر بھروسہ زندگی کے لئے عاقبت کیوں خراب کر رہے ہو۔ تمھیں تو چاہیئے کہ تم امن اور سلامتی کا مرکز بن جاؤ۔ یہ خونخواری اللہ کو پسند نہیں ہے۔ یہ ظلم ہے، استبداد ہے، کمزوروں اور نہتوں پر ستم ہے سراسر ناانصافی ہے۔ تم شیر ہو تمہارا فرض ہے کہ کمزوروں کی نگرانی کرو، تاکہ اُن کے خون اور گوشت سے اپنا پیٹ بھرو۔ پیٹ بھرنے کے لئے اللہ نے گھاس پیدا کی ہے۔ پیاس بجھانے کے لئے ندی کا ٹھنڈا پانی عطا کیا ہے —— شیر اُس کی باتیں سُنتا جا رہا تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بھیڑ کنکھیوں سے دیکھتی جا رہی تھی اور اپنی فتح مندی پر شاداں تھی۔ آخر شیر نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور خونخواری سے توبہ کر لی، پھر اُسی وقت تمام شیروں کو بلا کر نصیحت کی کہ کل سے گوشت حرام اور گھاس

حلال ہے — شیر دل نے بھیڑ کا شکریہ ادا کیا اور بڑے احترام سے زری تک الوداع کہنے کے لئے آئے۔ بھیڑ اپنے جنگل میں پہنچی تو بھیڑیں اُس کی انتظار میں تھیں۔ اُس نے نخمندی کی ساری داستان سنائی اور اسی روز یوم نجات مانا گیا — بالکل یہی حال انگریز نے مسلمان قوم سے کیا ہے۔ مسلمان کو مصلّے و تسبیح پر بٹھا کر دنیا کی زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

ضربِ اقبال

ولایت سے انگریز کے بھیجے ہوئے پادریوں نے ہندوستان میں آکر جال بچھانا شروع کر دیا۔ ان کی نگاہ دشمن اسلام پر تھی۔ انھوں نے آکر ایک طرف تو مولوی طبقہ کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کیا اور تقسیم کر کے ان کی ذہنی قوتوں کو مناظروں میں اُلجھا دیا۔ دوسری طرف قادیانی فرقہ کو ہوا دی۔ تیسری جانب آسمانی بادشاہت کے افسوں کو پوری طرح پھیلا دیا۔ اس منظم پراپیگنڈا کا اثر

یہ ہوا کہ مسلمان جہاد کے معاملہ میں نیچی نگاہ کر کے بات کرنے لگا۔ ان کے رہنما
قرآن پر چلتے تھے کہ اس میں جہاد کے متعلق آیات کیوں ہیں:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

ان پادریوں نے مسلمان کو رہبانیت کی تعلیم دی۔ لیکن جب سازش میں
کامیاب نہ ہو سکے تو لالچ کے دروازے کھول دیئے۔ حکومت ان کی تھی، روٹی
ان کے ہاتھ میں تھی، ہندوستان بھوکا تھا، بالخصوص مسلمان کی عام اقتصادی
حالت بہتر نہیں تھی۔ کچھ پڑھے لکھے نوجوانوں کو ان پادریوں نے اپنے حلقہ
میں کھینچ لیا، انھیں دفتروں میں ملازمتیں دیدی گئیں۔ جب اُن کی روٹی کا
مسئلہ حل ہوا تو دیکھا دیکھی اور بھی اُدھر جانے لگے عین اس وقت اقبالؒ
نے آواز بلند کی:

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگذر

اس مردِ حق گو اور حق بین وحق آگاہ کے سد تے ہیں وہ سیلاب بے پناہ
رک گیا۔ یہ اسی خیر خواہ کا اعجاز ہے کہ مسلمان کی نگاہوں کے زاویے بدل گئے۔

اور مغرب سے اس طرح روشناس کرایا:

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اور اپنے نہایت ہی سادہ دل مسلمان کو زمانے کے نشیب و فراز سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ ع

تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

اپنے بیگانے

قرآن کریم میں سختی سے حکم ہے کہ باہم اتحاد سے رہو، فساد نہ کرو، فرقوں میں نہ منقسم ہو جاؤ۔ قبیلوں اور جماعتوں کی تفریق مٹا دو، صرف ایک مسلمان ہو کر جیو۔ لیکن اسی قرآن میں حکم ہے کہ منقسم ہو جاؤ۔ آئیے ہم آپ کو اس "منقسم ہو جاؤ" کا مطلب سمجھائیں اور اپنی طرف سے نہیں بلکہ قرآن کی تفسیر سے

سترہ رمضان ۲ھ کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے برد آزما ہوئیں۔ یہ دونوں صفیں ایک دوسرے کے مقابلے میں شمشیر بکف کھڑی تھیں۔ ذرا دیکھیے کہ ان دونوں صفوں میں آمنے سامنے کون کون کھڑے تھے یہ وہ تھے جن کا ملک ایک تھا۔ جن کی زبان ایک تھی۔ حسب و نسب ایک تھا۔

وطن ایک قبیلہ ایک خون ایک اور اُن کے آباؤ اجداد ایک تھے — یعنی ایک طرف حضرت ابوبکر تھے تو دوسری طرف ان کا بیٹا تھا۔ ادھر حضرت خذیفہؓ تھے تو اُدھر اُن کے باپ عقبہ تھا۔ اُدھر حضرت عمر تھے تو ادھر آپکا ماموں تھا۔ ادھر حضرت علی تھے تو مخالف صف میں اُن کے بھائی عقیل تھے۔ ایک جانب حضرت محمدؐ خود تھے تو مقابل میں آپ کا چچا حضرت عباس تھا۔ اور آپ کے داماد ابوالعاص۔ ادھر ام المومنین حضرت سودۃؓ تھیں تو سامنے ان کے عزیز سہیل بن عمر۔

آپ نے دیکھ لیا کہ ان دو صفوں میں جو لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اُن کا باہم رشتہ کیا تھا! اس کے برخلاف حبش کا رہنے والا بلالؓ اپنا تھا۔ یہ پرایا اپنا تھا اور وہ اپنے قطعی پرائے۔ کیوں؟ قرآن اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کر رہا تھا کہ انسانی تقسیم کا صحیح معیار کیا ہے؟ اس ساری تقسیم کی وجہ ایمان تھی۔ اِسی ایمان نے انھیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا چنانچہ اس واقعہ نے اس حقیقت پر مہر لگا دی کہ لڑائی صرف اللہ کے لئے ہوسکتی ہے۔ اور جب جہاد فی سبیل اللہ کا سوال آجائے تو پھر انسانوں کے چہرے دیکھنا مناسب نہیں اُن کے دل دیکھنا مناسب ہے۔ لیکن آج ہماری اسلامی مملکت پاکستان میں عزیز و اقارب کو ایمان پر ترجیح دی جارہی ہے۔ قطعی یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جس شخص کی جس رتبے کے لئے سفارش کی جارہی ہے آیا وہ اس کا

اہل بھی ہے یا نہیں لیکن ایمان والوں نے ایسا نہیں کیا۔ لوگ آج بھی اس شر کے خلاف واویلا کر رہے ہیں۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اللہ نے اپنے لشکر کو مکہ سے نکال کر مدینہ میں اپنی پناہ میں لے لیا اور وہاں ان کی حفاظت کے سامان اور رزق کے سامان مہیا کر دیئے لیکن اصل مقصد اتنا ہی نہیں تھا کہ کسی محفوظ مقام پر پہونچکر محصور ہو جائیں بلکہ مقصد یہ تھا کہ طاغوتی قوتوں کی سرکوبی ہو جائے۔ تاکہ دنیا میں دین الٰہی کا نفوذ ہو۔ اللہ نے اس مقصد کے حصول کے لئے مومنین کے بازوؤں میں فولادی قوت عطا فرمادی۔ جس سے انھوں نے سرکشی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا۔ پھر اللہ نے اس لشکر کو آزادی کی فضا میسر کی، کیونکہ یہ فضا اور رزق اسی قوم کے نصیب میں ہے۔ جو طاغوتی قوتوں کا سر کچل کر آزادی کی فضا میں سانس لے۔ ورنہ غلامی کا رزق جسے (شجرۃ الزقوم) کہا گیا ہے بدترین رزق ہے۔ اس رزق سے تو گلا گھونٹ کر مر جانا بہتر ہے کہ زہر آلود نان خیر پر گزارہ ہو:-

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

شوکت عشق

جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی طرف سے سَتّر آدمی شہید ہوئے۔ مسلمانوں کے افلاس کا یہ عالم تھا کہ شہیدوں کے کفن کے لیے کپڑا بھی نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اس طرح دفن کیا گیا کہ ان کے پاؤں گھاس سے ڈھانپ دیے اور سر پہ کپڑا ڈالا گیا۔ دو دو شہیدوں کو ملا کر ایک ایک قبر میں دفن کیا گیا۔ جسے قرآن زیادہ یاد ہوتا تھا اُسے مقدم کیا جاتا۔ ایک صاحب اصیرم کے نام سے مشہور تھے۔ زندگی میں مسلمانوں کے ساتھ احسان اور مروت سے پیش آیا کرتے تھے لیکن مسلمان نہیں ہوئے تھے یعنی ایمان نہیں لائے تھے۔ اس جنگ میں انھیں جوش آیا اور بلا تامل تلوار لے کر میدانِ جنگ میں آ گئے اور مسلمانوں کی طرف سے لڑنے لگے حتیٰ کہ شہید ہو گئے۔ انہی کے متعلق روایت ہے کہ اصیرم نے ایک وقت بھی نماز نہ پڑھی لیکن جنت میں گیا۔

عشق نے اک جست میں طے کر دیے قصے تمام
اس زمین و آسماں کو لامکاں سمجھا تھا میں

خوگرِ حمد

قرآن کریم میں سورۂ توبہ میں ارشاد ہے:

"تاکہ کفار تمہارے اندر سختی اور صلاحیت محسوس کریں، اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بیٹھ جائے۔"

قرآن نے یہ جملہ خوگرِ حمد یعنی جماعت مومنین کی حمد میں ارشاد فرمایا ہے یہ جماعت ایک دوسرے کے زخموں کے لئے مرہم، دل کی ٹھنڈک، آنکھوں کی تسکین۔ تمام محبت کے سلسلہ میں منسلک۔ ایک نصب العین ایک سا مسلک و مقصدِ حیات۔ ایک راہِ عمل۔ ایک متحدہ قوم۔ ایک کے دکھ میں سب کا دکھ ایک کے سکھ میں سب کا سکھ۔ اگر ایک کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ سے آنسو چھلک آئیں۔ ایسا تعلق کہ جسدِ واحد معلوم ہوں۔ مظلوم کے لئے رحمت اور ظالم کے لئے عذاب۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گذر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

خدا کی آواز

جب خدا کے لشکر نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو اس وقت چاروں طرف تاریک مایوسیاں تھیں ظلمت انگیز ناامیدیاں تھیں۔ ان ظلمتوں کی تاریک راہوں سے یہ قافلہ چلا جا رہا تھا کہ ایک آواز اس بے سروسازوسامان اور عاجز کارواں کے کانوں تک پہونچی کہ

(اے پیروانِ دعوتِ ایمان) نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو۔ تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو بشرطیکہ تم سچے مومن ہو۔" (۳/۱۳۸)

مظلومی و بیکسی، درماندگی و لاچاری، ضعف و ناتوانی۔ ناامیدیاں اور مایوسیاں ایک لمحہ میں کامیابیوں اور کامرانیوں۔ تازگیوں اور شادابیوں۔ قوت و غلبہ اور شان و شوکت۔ جاہ و جلال اور دولتِ لازوال میں بدل گئیں جب کسی نے یہ کہا:-

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی

اِس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نگہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائیگی

اور کبھی اِس قافلے کو یادِ عزیز و اقارب نے خون کے آنسو رلایا۔ فطرت کے سامنے وہ گھڑی مسکرا رہی تھی جس گھڑی کے نصیب فتح مکہ میں عظمت مقدر کردی گئی تھی۔ مکہ جہاں اللہ کی تائید و نصرت کو جلوہ بار ہونا تھا۔ فطرت ان مایوس دلوں کو مسکراہٹ کی جاں بخش جھلک کے ساتھ پیامِ نصرت دے رہی تھی۔

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائیگی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

اسلام میں زندگی کا تصور

ہندو مت میں ایک فرقہ ایسا بھی ہے جس کا یہ عقیدہ کہ کائنات کی ہر شے میں روح ہے حتےٰ کہ نباتات بھی احساس جان رکھتی ہے اسی نظریہ کے ماتحت انکا اصول ہے کہ ہر شے سے نرمی کا برتاؤ کیا جائے تاکہ اسے کسی قسم کا دکھ محسوس نہ ہو۔

لیکن اسلام اسکے برعکس نظریہ رکھتا ہے اسلام کے نزدیک ہر جاندار (علاوہ انسان کے) اور غیر جاندار صرف انسانی تصرف کے لئے عالم وجود میں لائی گئی ہے اور انسان کو اختیارات عطا فرما دے گئے ہیں کہ وہ اپنی بصارت۔ جسارت۔ ادراک اور ضروریات کے مطابق ان چیزوں سے کام لے کیونکہ انکے پہلو میں وہ شے ودیعت نہیں کیگئی جسکا نام زبانِ فطرت میں دل ہے۔ یہی وہ شے ہے جو زندگی کی شورشوں میں شریک ہو کر ارتقائے انسانیت کی منزلیں طے کرتی ہے اور یہ منزلیں طے کرکے انسان کو مقام زندگی پر جلوہ افروز فرماتی ہے۔ چنانچہ حضرت اقبال نے نباتات کو اسی نورِ بصیرت سے دیکھا ہے

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
اے گلِ رنگیں تیرے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں
یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اِس چمن میں مَیں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

یہ عالم بناتات اپنی نمود اور ارتقا کے لئے محتاج ہے کہیں یہ دہقان کا زیرِ بارِ احسان ہے تو کہیں چاند سورج بلکہ محتاج ۔ کہیں منت کشِ بادوباری ہے تو کہیں منت پذیرِ باغباں ۔ تقاضۂ فطرت ہے کہ جو شے اپنی حفاظت کی ذمہ داری دوسری قوت پر ڈال دیتی ہے پھر اسے ایک قسم کا اطمینان محسوس ہوتا جو دراصل موت کے مترادف ہے زندگی کی جھلک نہیں ہوتی ۔ اور جو سراپا سعیِ پیہم ہیں محو و مستغرق ہوگا زندگی یقیناً اس کے بناز کے لئے بیتاب رہیگی ۔ اسی اطمینان کو علامہ نے مطعون فرمایا ہے ۔

مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

اور اپنی سعیِ بیتاب کو خوابِ جنت اور راہِ فردوس سے تعبیر کیا ہے

یہ پریشانی میری سامانِ جمعیت نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو

قرآنِ حمید نے بنی اسرائیل کی نافرمان اور تن آسان قوم کو چالیس برس کھلے میدانوں میں سرگرداں رکھا اور پھر نئی پود کو حکومت جیسا انعام بخشا وہ اِسلئے کہ اس پود میں حیاتِ آزاد کا تصور انگڑائی لیکر بیدار ہو چکا تھا ۔ وہ پود سراپا سعیِ پیہم بنکر میدانِ عمل میں نکل اطاعت موسیٰ قبول کر چکی تھی تو زندگی کی تلاش میں نکلی تو زندگی نے آواز دیکر اپنی طرف بلالیا ۔ یہی تلاش مستقل زندگی کی شمع فروزاں ہے ۔

یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے



قرآنِ پاک نے شاعری کو ایسا تاثر کہا ہے جس سے انسانی تخیل کی کشمکش اور جد و جہدِ حیات برف کے تودے بنکر رہ جائے۔ قرآن کا یہ فیصلہ چونکہ خالقِ اکبر کا فیصلہ ہے لہٰذہ اس میں کسی نکتہ چینی کی گنجائش ہی نہیں ہے لیکن قرآن کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ ہر معاملہ میں سوچ بچار سے کام لو دانش جیسی نعمت اسی غرض سے عطا فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ جب ہم شاعری کی بحث میں اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو دنیا کی ایسی قومیں جنہیں شاعری اور محض شاعری سے ہی واسطہ رہا تنزل کی عمیق گہرائیوں میں تباہ حال نظر آتی ہیں۔ شاعری سے مراد ہر وہ تجویز ہے جس کے نقشے تو بنا لئے جائیں لیکن عملی طور پر وجود قائم نہ کیا جائے۔ اِسی تن آسانی کا دوسرا نام شاعری ہے اِسی تن آساں کا دوسرا نام شاعر اور اِسی تن آساں قوم کو شاعروں کی قوم کہتے ہیں۔

وہ شاعری جو زندگی میں عمل و حرکت کی رُوح پھونک دے شاعری نہیں اعجازِ مسیحائی ہے۔ وہ شاعر جو اپنے تخیل کی قوتوں سے قوم میں تازگی اور پیکرِ ملی میں رُوحِ کار پیدا کر دیتا ہے محسنِ قوم ہے۔ ایسی ہی شاعری پیامِ حیات ہے۔ اگر عام

نقطہ نظر سے شاعری وہ نثر ہے جو لے سے پڑھی جائے تو قرآن کو بھی خوش الحانی سے پڑھنے کا حکم ہے بلکہ ثواب ہے۔ اور نثرِ قرآن کی تنظیم و ترتیب اس انداز سے مرتب ہے کہ بہترین نظم معلوم ہوتی ہے۔ بعض آیاتِ مقدمہ میں تو قافیے ردیف تک موجود ہیں اور ان آیاتِ مکرمہ کو پڑھنے میں ایسا سرور ملتا ہے کہ سامعین کو بھی مسرت حاصل ہوتی ہے دراصل قرآنِ پاک نے ایسی شاعری کو جو انسانی زندگی کے قوٰے کو شل کر دے ناجائز قرار دیا ہے تاکہ اسکے عمل سے قومیں مردہ نہ ہو جائیں اور حیاتِ اجتماعیہ میں تن آسانی نہ آ جائے۔ ورنہ ایسا شاعر جسکے نغمے سرمایہ حیات ہوں قوموں کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔ حضرت علامہ نے بھی ایسے ہی شاعر کو مخاطب فرمایا ہے۔ ؎

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ دار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

قرانِ پاک کے نزدیک زندگی کی معراج، معراجِ انسانیت ہے۔ اور یہ معراج انسانی اخلاق و کردار کے ارتقا کا دوسرا نام ہے۔ جب آدمی مادی

تو لوتوں کی تسخیر کے بعد شرفِ انسانیت کی منازل طے کر کے مقامِ بشریت حاصل کرتا ہے تو وہاں پہنچکر اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ فی الواقعہ خلیفۂ ارض ہے اور پھر وہ اس ابرِ آزاد کی طرح ان تمام پستیوں سے بلند ہو کر فضائے کائنات پر چھا جاتا ہے جسکا مقام قیودِ مکانی سے آزاد ہوتا ہے۔ اور یہی حیاتِ مردِ مومن کی تفسیر ہے۔ علامہ فرماتے ہیں

ے ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابرِ کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ میرا بحر مرا بن میرا

جب ایسا مردِ مومن جسکے لئے سکوت حرام ہے تسکینِ جسم کے لئے لمحہ بھر کی خاطر راحت کا طالب ہوتا ہے تو کائنات کی آنکھیں بسترِ استراحت پر کلیاں بچھاتی ہیں

کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

اِس مردِ مجاھد کے حضور میں ہر ذرۂ کائنات ھدیہ نیاز پیش کرتا ہے۔ دنیا کی امامت اسکے سر پر کلاہِ حشمت رکھتی ہے۔ جب یہ آزادی و حیات کا علمبردار زندگی کے ساز پر نغماتِ الہٰی کی دھن الاپتا ہے تو ساری دنیا اسکی نوائے جانفزا سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو جاتی ہے۔ غلام آبادیاں اسکی راہ دیکھتی رہتی ہیں۔ جس راستے سے اسکا قافلہ زندگی گذر جاتا ہے ظالموں سے سرمایہ زندگی چھین کر مظلوموں میں بانٹ دیتا ہے۔ اگر یہ

اگر یہ ابر وقت کسی وادی سے خاموش گذر جاتا ہے تو وہ ناحول زندگی سے مایوس ہو کر موت کی آغوش میں سر رکھ کر سو جاتا ہے۔

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں
کسی بستی سے جو خاموش گذر جاتا ہوں

انسان میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو قدرت کے معجزوں میں ہیں۔ انسان کے خزانے ان موتیوں سے معمور ہیں جنکی چمک سے دنیا نورانی ہوتی ہے کم و بیش خدا کی تمام صفات اسکے بنانے کے خمیر میں ودیعت کر دی گئی ہیں لیکن مستفید وہی ہو گا جو ان سے کام لیگا۔ اگر کوئی ناک بند کرے تو پھول کی بو کا کیا قصور جو اسکا دماغ معطر نہ ہو سکا اگر کوئی کان بند کرے تو آواز و پکار کا کیا گناہ جو اس اعلان سے آگاہ نہ ہو سکا۔ فطرت نے انسانی فطرت کو خوبیاں اور قوتیں عطا فرمائی ہیں ان سے بے نیاز ہو جانا اور با خبر ہونا دونوں انسان کے اختیار کی چیزیں ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ بھی آدمی تھے انہوں نے مردوں کو زندہ کرنے کی قوت سے کام لیا وہ قوت اسکے اختیار میں آگئی اگرچہ وہ براہِ راست من جانب اللہ تھی لیکن تھی وہ ایک قوت اور وہی قوت جو خود اللہ کی صفات میں شامل ہے۔ جب آدمی انسانیت کی معراج حاصل کر لیتا ہے تو پھر یہ اعجاز اسکی ذات کے محتاج ہو جاتے ہیں۔

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے اور پرندوں کو کیا محوِ ترنم میں نے
سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے • غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے

فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

قرآنِ پاک کی تعلیم نے دنیا کو یہ سبق دیا ہے کہ اپنی معاشرت میں بود و باش کو اتنی اہمیت نہ دی جائے کہ زندگی کا نصب العین بنکر رہ جائے۔ رہائش کی اہمیت جب حد سے تجاوز کرتی ہے تو انسان میں فطرتؔ تن آسانی کا شعور پیدا ہوتا ہے اور جب یہ شعور بیدار ہو کر روزمرہ زندگی میں کارفرما ہوتا ہے تو پہلے یہ انفرادی طور پر انسانوں کے قوائے زندگی شل کرتا ہے پھر اجتماعی طور پر بیداری کے جوہر کو سلا دیتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں یہی سے تنزل کا باعث بنتی ہے۔ اس کے برعکس مجاہدانہ زندگی ہے۔ اس زندگی نے موازمات تن آسانی کے سامان نہیں ہوتے بلکہ سیدھے سادے ڈھنگ ایک قلندرانہ انداز رکھتے ہیں۔ تکلفات سے بے نیاز ہو کر آدمی جد و جہدِ حیات میں سراپا سعیِ پیہم نظر آتا ہے۔ اسی سعیِ پیہم کا دوسرا نام حلال کی روزی ہے لیکن ہمارا سرمایہ دار طبقہ جو مزدور کی محنت پر جیتا ہے آدمی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ یہ تاجر طبقہ سود کے سہارے زندہ رہتا ہے اور اس سانس لینے کا نام زندگی نہیں ہے۔ یہ تساہل اور تجاہل تن آسانی کی دلیل ہے۔ یہ تن آسان طبقہ عملی زندگی سے گریز کرتا ہے۔ ہ

ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پر تو پھر اٹھ نہیں سکتا

جب یہ تن آسان طبقہ نرم بچھونوں پر پڑ جاتا ہے تو واقعی ان میں سے صلاحیت کے جوہر ختم ہو جاتے ہیں۔ قرآن غلام قوموں سے مخاطب ہے کہ اپنے اندر صلاحیت پیدا کرو کیونکہ وراثتِ ارضی صالح قوم کے لئے ہے یہ صلاحیت جس کے متعلق قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے سعیِ پیہم اور مستحکم ارادوں کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی قوم نے جب تک یہ صلاحیت کے جوہر اپنے اندر پیدا نہ کر لئے وہ مستقل طور پر چالیس سال تک میدانوں میں سرگرداں رہی۔ اور جب ان میں صلاحیت پیدا ہو گئی اور وہ صالح بن گئے فطرت کا اٹل قانون انکی طرف جھک گیا۔ فرعون معاشی طور پر اس قدر خوشحال تھا کہ اسکی نظیر نہیں ملتی لیکن صلاحیت کے اعتبار سے وہ اندر سے کھوکھلا تھا اور جو درخت اندر سے کھوکھلا ہو وہ تند ہواؤں کا کب تک مقابلہ کر سکتا ہے۔ آخر وقت کے تقاضے نے اس کا سرِ نخوت کچل دیا۔ ایسے ہی انسان جو اپنے تئیں امیر۔ خوشحال اور سرمایہ دار کہلاتے ہیں معاشی اعتبار سے وہ سوسائٹی میں بلند نظر آتے ہیں مگر حقیقت ان کی اُس پہاڑ سی ہوتی ہے جو گلہری کے مقابلے میں ایک چھالیا تک نہ توڑ سکے۔ ؎

قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھکو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھکو

قرآن مجید غلام ذہنیتوں کی تفسیر کیلیئے بنی اسرائیل کیطرف اشارہ کرتا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو فرعون کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر نکل آئے تو ان لوگوں نے اظہار تاسف کیا۔ اور موسیٰؑ سے برملا کہا کہ ہم مصری لوگوں کی غلامی میں بہت آرام سے تھے وہ ہماری ہر ضرورت کے ذمہ وار تھے وہاں ہمیں بہت آسائیشیں تھیں تم نے ہم پر ظلم کیا جو انکی غلامی سے چھڑا کر لے آئے ہو ——— دیکھا جائے تو یہ الفاظ انکی فطرت کے آئینہ دار نہ تھے بلکہ اس ذہنیت کے ترجمان تھے جو برسوں سے غلامی کی تہ میں رہ کر زنگ آلود ہو چکی تھی اور اسکے آئینہ آزادی کے تمام جوھر چھپ گئے تھے۔

عین وہی تماشہ آج ہماری نظروں نے دیکھا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مہاجرین میں سے زیادہ تعداد ان مسلمانوں کی تھی جو اس تقسیم کو اصولی طور پر غلط کہہ رہے تھے۔ ان میں ایسے بھی لوگ تھے جو قائدین ملت کو سرِ عام گالیاں سنا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جہنم میں گئی ایسی آزادی جس کے بدلے میں وطن چھوٹا۔ عزیز و اقارب بچھڑ گئے۔ دولت لٹ گئی۔ گھر ویران ہو گئے اور اب بے ٹھکانہ ہو کر چلے آئے ہیں۔ اور یہ بالکل موسیٰ کی قوم کی طرح چیخ

رہے تھے کہ ہمیں واپس پہنچا دو۔ ہمیں اپنے گھروں کو جانے دو۔ ہمیں وہ وطن عزیز ہے۔ ہم آگے نہیں بڑھینگے۔ یہ پاکستان کی زینت ہمیں پسند نہیں ہے اسکی مٹی ہمارے کھیتوں کی مٹی سے نہیں ملتی۔ ہمارے ڈنگر ڈھور ہمیں واپس بلا رہے ہیں۔ ہم ہندو کی حکومت میں رہینگے۔ ہم صدیوں انگریزوں کی حکومت میں رہے ہیں کونسا ہمارا ایمان خراب ہوگیا ہے۔ ہماری مسجدیں آزاد رہی ہیں ہماری نمازوں پر کوئی پابندی نہیں رہی پھر ہندو کی غلامی میں کیا ہرج ہے ہم سے ہمارے گھر نہ چھڑاؤ۔ یہ طبقہ سخت واویلا کر رہا تھا اور غلام بھیڑوں کی طرح کہہ رہا تھا۔ ؎

یہ چراگاہ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا — یہ ہری گھاس اور یہ سایا
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں — یہ کہاں بے زباں غریب کہاں
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں — لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اسکے دم سے ہے اپنی آبادی — قید ہم کو بھلی کہ آزادی!
سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا — واں کی گذران سے بچائے خدا
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا — ہم کو زیبا نہیں گلا اس کا

قدر آرام کی اگر سمجھو
آدمی کا کبھی گلا نہ کرو



طریقِ حیات اور اندازِ معاشرت کے بارے میں اسلام نے

نہایت وضاحت سے فرما دیا ہے کہ وہ انسان جو فرعونیت کا تمدن لیکر جینا چاہتا ہے زیادہ عمر نہیں جی سکتا اس لئے کہ اسکی یہ زندگی فطرتِ صحیحہ کے خلاف ہے آدمی کو مخلوق پر شفیق ہونیکی تلقین کی گئی ہے اسی نظریہ مصلحت کے ماتحت انسانوں کو انفرادی زندگی سے منع فرما کر اجتماعی زندگی کی ہدایت کی ہے تاکہ جماعت میں داخل ہو کر ہر انسان ایک دوسرے کے لئے اس طرح باعثِ رحمت بنجائے جیسے جسم کا ایک ایک عضو۔ جب انسان کائنات پر شفقت کی تمنا کرتا ہے تو اس کا ہیجان جذبات اس طرح زبان پر آجاتا ہے۔ ؎

دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

وہ انسان کائنات کے لئے باعثِ رحمت ہے جو دوسروں پر شفقت کی آرزو رکھتا ہے اور جو ظالم بنکر دوسروں کی خوشیاں چھین کر اپنا دامن استراحت بھرنا چاہتا ہے وہ بھیڑیا ہے۔ درندہ ہے۔

وحشی ہے اور ظالم ہے ۔ اس سے بہتر ایک ننھا سا کیڑا ہے وہ جگنو جو اندھیرے میں دوسری مخلوق کے لئے اجالا بنجاتا ہے اس انسان سے کہیں بہتر ہے جو اجالے میں اندھیرے کا سامان پیدا کرتا ہے ۔ ؎

پہنچوں کس طرح آشیاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سنکر بلبل کی آہ وزاری جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی بنوں گا



جس طایر کی فطرتِ آزاد خوگر قفس نہیں ہوتی وہ ایک لمحہ بھی کنج قفس سے مانوس نہیں ہوتا لیکن ایسی روح جسکا بچپن ہی قفس میں گذرا ہو وہ آزاد فضا کی وسعت سے کیونکر باخبر ہوسکتی ہے ۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ پالتو چکور صیاد کے پیچھے پیچھے پنجرے کے تعاقب میں کشاں کشاں چلے جارہے ہوتے ہیں ۔ اور یہ آزاد فضا انکے لئے وبالِ جان ہوتی ہے وہ اس کھلی فضا کو نئی دنیا سمجھتے ہے حالانکہ یہی دنیا اسکی فطرت کی دنیا ہوتی ہے لیکن غلامی کے زنگ سے جوہرِ فطرت دب چکا ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس مرغِ نوگرفتار کی حالت بھی دیکھی ہے کہ وہ قفس میں پھڑپھڑاتا ہے ۔ لوہے کی سلاخوں سے ٹکراتا ہے ۔ اس کشمکش میں اس کے پر پرزے بھی ٹوٹ جاتے ہیں ۔ اس کا جسم

نازک بھی زخمی ہو جاتی ہے ۔ یہ سعیِ مستقل اسے تھکا دیتی ہے لیکن کوئی قوت اسکی آزاد روح کو تھکا کر خاموش کر دینے میں کامیاب نہیں ہوسکتی وہ دم لیکر پھر تازہ دم ہوتا ہے اس کی یہ تڑپ اس وقت تک بیدار رہتی ہے جب تک اسکی فطرت زنگ آلود نہیں ہوتی ۔

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہوگیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

جب قوموں میں صالحیت آجاتی ہے تو انکے ارادوں کو اونگھ تک نہیں آتی وہ سعیِ پیہم میں راحت اور جستجو مسلسل میں عشرت کا لطف لیتی ہیں کیوں کہ اسی جد و جہد مستقل میں فتح و ظفر مندی مضمر ہوتی ہے یہی وہ مقام ہے جہاں ان کے اقبال کے ستارے چمکتے نظر آتے ہیں۔ عمل اور پیہم عمل ان کی رگ و پے میں اس انداز سے سما جاتا ہے کہ وہ کسی ایسی تبدیلیِ حیات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں جس میں تن آسانی کے سامان ملیں ۔ حتیٰ کہ وہ موت کے بعد کی زندگی کو بھی آرام و راحت کی نظر سے قبول نہیں کرتیں ۔ یہ آزاد قوم موت سے پوچھ لیتی ہے کہ ۔

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا ؟
واں بھی انسان ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا ؟



خرد مندی ۔ ذہانت ۔ اندیشہ ۔ فکر اور نگہ دُور رس کا دوسرا

نام عقل ہے یہ قوت ہر فطرت کو عطا ہوئی ہے اس کائنات میں ہر جاندار اسکے ماتحت اسکی مجوزہ راہوں پر گامزن ہے۔ لیکن آدم کو اس کے مطیع بھی رکھا ہے اور اس پر حاکم بھی۔ زندگی کے بعض تقاضے اکثر مقامات پر خرد کو خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور وہاں عقل کو بھی لازم آتا ہے کہ خاموش ہو جائے ورنہ یہی عقل فساد و شر کا سبب بنکر رہ جاتی ہے ان راہوں میں صرف دل کی روشنی رہنما ہوتی ہے عقل کا چراغ اس منزل میں رہبری نہیں کرسکتا چنانچہ علامہ اقبال کا یہ مقالہ عقل و دل کی تفسیر ہے۔

عقل

عقل نے ایکدن یہ دل سے کہا — بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر۔ گذر فلک پہ مرا — دیکھو تو کسقدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا — مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسر کتابِ ہستی کی — مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
بوند اِک خون کی ہے تو لیکن — غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں

دل

دل نے سنکر کہا یہ سب سچ ہے — پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
راز ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جُو۔ خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بیتابی — اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش ربِ جلیل کا ہوں میں

قرآن پاک نے فرما دیا ہے کہ ہم نے زمینوں کے اندر علوم و فنون کے خزانے دفن کر رکھے ہیں انسان انہیں کھود کر اپنے استعمال میں لائے۔ آگ ہوا پانی اور برق و باران میں بھی طاقتیں پوشیدہ ہیں جو علم کے ذریعہ انسان کے اختیار میں آسکتی ہیں۔ یہ چیزیں اس وقت تک مردہ ہوتی ہیں جب تک اپنی جگہ پر قائم رہیں لیکن جونہی انسان کے ناخنِ تدبیر نے کریدنا شروع کیا ان میں زندگی کے جوہر بیدار ہونے شروع ہوئے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ محتاجِ تدبیرِ انسان ہے۔ یہ معمور خزانے رہین تجسس نہیں۔ یہ خاموش قوتوں کے بے پناہ خزانے آدمی کے منت پذیر ہیں کہ انہیں حرکت دیکر زندگی عطا فرمائی جائے۔ آدمی نہ ہو تو یہ تمام مادہ قوتیں بیجان و بے روح ہیں۔ قرآن خود ایک سائنس ہے۔ اور یہی سائنس مادہ دنیا کی روح ہے۔ ؎

قایم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے

ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے

وہ انسان جو قدرت کا مکمل آئینہ ہو اور اپنے اندر نورِ الٰہی کی جھلک تک محسوس نہ کرے بینا نہیں نابینا ہے۔ آگ کا یہ احساس کہ اسکے اندر جلانے والی قوتیں مضمر ہیں اسے گرم رکھتا ہے۔ سیماب کا جوہر سیمابی

ختم ہو جائے تو اسکے قلب کی حرکت بند ہو جائے۔ زندگی کا یہ احساس ہی اُسے ہر وقت بیتاب رکھتا ہے۔ وہ شمع جو بظاہر روشن ہو لیکن اس روشنی کے نور کو اپنے سینے میں منور نہ پائے روشن نہیں تاریک ہے ؎

تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں
بینا ہے اور سوزِ دروں پر نظر نہیں

لیکن وہ انسان جو اپنی خودی سے واقف ہے یوں خاموش نہیں جلتا۔ ؎

یہ آگہی میری مجھے رکھتی ہے بیقرار
خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار



قرآن پاک نے ہر اس زندگی اور زندگی کے شعبے کو مردہ کہا ہے جو جد و جہد سے گریز کرے۔ اس گریز کا دوسرا نام تن آسانی ہے۔ دنیا میں ایک فرقہ ایسا ہے جو جد و جہد سے کنارہ کش ہو کر راہبانہ زندگی کا طالب ہے۔ یہ راہب فرقہ عیسائیت نے پیدا کیا ہے۔ ان کے بعد ہندو مت نے اس خیال کو اپنایا اور جوگیوں کا بہروپ دھار کر جنگلوں میں رہنا شروع کیا۔ یہ راہب اور جوگی ایک ہی خیال کی دو کڑیاں ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اگر وصالِ الٰہی کی آرزو ہو تو انسان دنیا کی محفل سے الگ ہو کر گوشۂ تنہائی میں عبادت کرتا رہے۔ ان کے ہاں عبادت کے بھی مختلف طریق ہیں۔ کوئی برسوں بازو اُبھار رکھتا ہے کوئی ٹانگ۔

اس طرح اپنا تندرست عضوِ جسم بیکار بنا کر دنیا پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہم مہا بھگت ہیں اور پر ماتما کے درشن کر چکے ہیں ۔ یہ ایک فریب ہے جس میں وہ مستقل طور پر مبتلا رہتے ہیں اور دنیا پر اپنی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دیتے ۔ اسلام کے نزدیک یہ تنہائی کی زندگی درست نہیں ہے۔ اسلام اسکی اجازت نہیں دیتا کہ حیاتِ اجتماعیہ سے رشتہ منقطع کر کے گوشۂ تنہائی میں بے مقصد اور بے نصب العین تمام فرائض کو بھلا کر پڑے رہو۔ اللہ کو یہ عبادت پسند نہیں ہے ۔

اللہ نہیں چاہتا کہ ایسے لوگوں کے ان خیالات کو تقویت دیکر عام کیا جائے ۔ ؎

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب | کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا | ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خاشی پر یہ آرزو ہے میری | دامن میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گذاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو



قوم کے افراد جب انفرادی زندگی کو ختم کر کے حیاتِ اجتماعیہ کے دائرہ عمل میں داخل ہوتے ہیں تو انکی حیثیت اس قطرہ کی سی رہ جاتی ہے جو دریا میں گم ہو کر بظاہر فنا ہو چکا ہو ۔ اِس اجتماعی زندگی کا ایک نصب العین ایک پلیٹ فارم ۔ ایک امیر جماعت ۔ اور ایک پرچم ہوتا ہے ۔ انفرادی

غلطیاں اجتماعی پردے میں اس طرح چھپ کر رہ جاتی ہیں کہ دیکھنے والے ان کے وجود کو چھو بھی نہیں سکتے۔ سوسائٹی کا کوئی قانون جماعت کے ایک فرد کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا۔ ہر عمل جماعت کا عمل ہوتا ہے اور ہر حرکت جماعتی حرکت ہوتی ہے۔ یہ افراد کچھ اس انداز سے ہم آہنگی اختیار کر جاتے ہیں کہ جماعت کی مجموعی تکلیف کو ہر فرد اس طرح محسوس کرتا ہے جیسے اسکے جسم میں کانٹا چبھ گیا ہو۔

صدمہ آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر — اشک بنکر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر
دل میں ہو سوزِ محبت کا وہ چھوٹا سا شرر — نور سے جسکے ملے رازِ حقیقت کی خبر

شاہدِ قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہو
سر میں جز ہمدردیِ انساں کوئی سودا نہو



اور جب یہ اجتماعی نظام منتشر ہوتا ہے اور اس حیاتِ اجتماعیہ کے تار و پود بکھر کر انتشار اختیار کرتے ہیں تو اس جماعت کے افراد کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ہولے بگولوں میں کم زور تنکے۔ وہ فرد جو اجتماعی زندگی میں فولاد سے زیادہ مضبوط اور چٹان سے زیادہ مستحکم تھا شاخ شکستہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے جماعت پتیوں کے اجتماع کا دوسرا نام ہے اور پتیوں کے اجتماع کا دوسرا نام پھول ہے۔ اگر یہ پتیاں بکھر کر منتشر ہو جائیں تو کوئی زبان اس انتشار کو پھول کے نام سے نہیں پکاریگی بعینہ یہی حال قوموں کا ہوتا ہے۔ قوم کا شیرازہ بکھر کر جب انفرادی

شکل اختیار کرتا ہے تو دنیا اسے قوم کے نام سے نہیں پکارتی یہی انتشار اسکا زوال ہے اور وہی اجتماع اس کا عروج تھا۔

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گل کہوں
کس طرح تجھ کو تمنائے دلِ بلبل کہوں
میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اِک تصویر تو
خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو

لیکن یہ فکرِ ملت بھی جو درحقیقت ایک نعمت ہے اُس وقت ذہنِ انسانی میں انگڑائی لیتا ہے جب صالحیت بیدار ہو چکی ہو۔ جب قوم آزاد ہو۔ جو قوم زمین کی مالک نہیں ہے وہ تقدیر کی مالک بھی نہیں ہے۔ ایسی محکوم قوم اگر فکرِ ملت کا تصور بیدار کریگی تو حکومت کا قانون اور حاکم کا استبداد تصورِ آزادی کا سر کچل کر رکھدیگا۔ اس منزل میں سعیِ پیہم ہی کام آتی ہے۔ یہ سعیِ پیہم حاکم وقت کی نگاہ میں بغاوت کا کانٹا بنکر کھٹکتی رہتی ہے۔ لیکن جن قوموں کے فکر کے خزائے نور سے معمور ہوتے ہیں وہ آزادی کی راہ میں تمام مصیبتوں کا مقابلہ کرتی رہتی ہیں۔ اور جس قوم کا شعور اور فکر مر چکا ہو اسے کوئی ضرب بیدار نہیں کر سکتی۔ قوم وہی زندہ ہے جس کی اجتماعی زندگی میں فرقہ بندی کا زہر پرورش نہ پا رہا ہو۔ سیاستِ حاضرہ کا اعلان ہے کہ اگر کسی قوم کو ختم کرنا مقصود ہو تو اس کے اندر ایسا انتشار پیدا کرو کہ وہ فرقوں میں تقسیم ہو جائے کیونکہ یہی وہ محشر سیلاب ہے جس میں قومیں بہہ گئی ہیں۔

واںہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زبان
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

اگر بدبختی سے کسی قوم کا شیرازہ کسی کرشمہ باطل کے اعجاز سے منتشر ہوگیا ہو اور وہ فرقوں میں منقسم ہوکر اندرونی خلفشار کی رو میں بہہ کر راہِ بہبود کو چھوڑ بیٹھی ہو تو اس وقت قائدینِ ملت کا فرض ہے کہ اپنی تمام قوتیں پھر ملی شیرازہ بندی میں صرف کردیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس چراغِ حق کو بجھانے کے لئے مخالف ہوائیں تیز رفتار ہو جائیں مگر ؎

عرض مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

اور پھر قومی شاعر کا فرض اولین ہے کہ اپنے کلام میں وہ جادو پیدا کرے جس سے مردوں کی رُوح بیدار ہوجائے۔ ؎

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشہ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگادے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلادے شعلۂ آواز سے

قرآنِ پاک میں موت کے متعلق نہایت وضاحت سے ارشاد ہے کہ ہر شے ہر موت لازم ہے ہر زندگی کو موت آئیگی۔ اور یہ نظام۔ یہ انتظامِ عالم جب اس کی تکمیل ہو جائیگی تو ختم ہو جائے گا۔ پھر اسے ختم کرنے کے بعد دوسرا انظام شروع ہوگا۔ موت کا تاثر اور نتیجہ چونکہ خاتمہ ہے اس لئے اکثر مخلوق خدا اس کے تاثر سے متاثر ہوکر کاروبارِ حیات میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ دنیا فنا کا مقام ہے کوئی بشر وقت سے آگاہ نہیں ہے پھر سلسلۂ حیات کو اہمیت کیوں دی جائے زندگی کا انحصار گنتی کے دنوں پر منحصر ہے اور یہ گذر ہی جائینگے پھر تکلف کیا! لیکن اسلام اس تخیل کے خلاف تعلیم دیتا ہے وہ انسانوں کو اور قوموں کو موت سے بے نیاز کر کے مجاہدانہ زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام میں موت سے کھیلنے اور موت پر غالب آنے کا نام زندگی ہے۔ جو قومیں موت سے کھیلتی ہیں موت انکا احترام کرتی ہے جو موت سے بے نیاز ہو جاتی ہیں موت انکی زندگی کو چھو نہیں سکتی۔ اور ایسی ہی مجاہد قوم سے موت لرزتی ہے۔ ؎

اڑاتی ہوں میں رختِ ہستی کے پرزے
بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا

مِری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے
پیامِ فنا ہے اِسی کا شرارا

لیکن جب یہ طوفانِ فضا اپنی پوری قوتوں کے ساتھ بل کھاتا ہوا کسی مردِ مومن کے سامنے جاتا ہے تو اسکی تمام سرکشی سجدہ ریز ہوجاتی ہے۔ اِسکی ساری بیباکی سرنگوں ہو کر اطاعت کا اقرار کرتی ہے۔

موت نے مجاہدوں کے حضور میں اپنی بے بسی کا اعلان کیا ہے۔ ؎

مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی
وہ آتش ہے میں سامنے اسکے پارہ



تاریخِ عالم بالعموم اور تاریخِ اسلام بالخصوص اس حقیقت کا اعلان کرتی ہے کہ جب بھی قوموں پر کوئی افتاد پڑی قوموں کے شعراء نے حرارتِ سخن سے تنزل اور بزدلی کے وجود کو پگھلا کر نابود کر دیا۔ اکثر اوقات انکی شاعری قوموں کے اقبال کا ستارا ابنکر چمکی اور قوم کو تنزل کی عمیق گھاٹیوں سے اٹھا کر عروج وسطوت کی بلندیوں تک لے گئی۔ ؎

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست وپائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

فطرت سے بے نیاز ہو کر زندگی کی راہوں پر چلنے کا دوسرا نام جہالت یا کم نگاہی ہے۔ ورنہ کائنات میں ذرہ سے آفتاب تک ہر شے اپنے اندر خزینۂ اسرار لئے ہوئے ہے۔ ہر چیز میں زندگی کے راز مضمر ہیں اگر کوئی صاحبِ بصیرت نظر سے کام لے تو اسے دریا کی بیتاب موجوں کی بیتابی کے بعد معلوم ہو سکتے ہیں ورنہ بظاہر یہ ہل چل فضا کی حرکت کی دلیل ہے۔ کون جانتا ہے کہ موج ساحل سے ٹکرا کر کیوں تڑپ جاتی ہے اور کونسی جستجوِ مسلسل اسے سعیِ مستقل کے لئے سرگرمِ عمل رکھتی ہے۔ دیکھنے والی نگاہ اور سمجھنے والا شعور ہو تو موج کی نوائے خفیف کا مفہوم سطح پر اُبھر کر آجائے۔ ؎

زحمتِ تنگیِ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

جو صاحب نظر بیتابی موج کی حقیقت سے روشناس ہو جائے پھر اس کا فرض ہے کہ دوسروں کو بھی اپنی نگاہوں سے وہ حقایق پنہاں دکھائے جس کے نظارے سے اسکی تلاشِ مسلسل کو سکونِ روح حاصل ہوا ہے۔ کیونکہ ہر آنکھ اِس تماشے کو نہیں دیکھ سکتی۔ دیکھ کر دیکھ لینا صاحبِ بصیرت کو ہی نصیب ہے۔ ؎

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اسکی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بُود

علامہ اقبال نے اس راز سے آگاہی حاصل کی اور اپنا فیض عام کیا ؎

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لئے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لئے

ایسے حق بین و حق شناس شاعر کو عام نقطہ نظر سے صرف شاعر کہدینا ایک حد تک ظلم ہے کیونکہ ایسے شاعر اظہار بیان کے لئے مقصود بیان کو ایک تنظیم میں پیش کرتے ہیں انہیں بحر و عروض یا قافیہ ردیف کی پابندی سے غرض نہیں ہوتی۔ ؎

طعنہ زن ہے کہ شیدا کنج عزلت کا ہوں میں
دیکھ اے غافل پیامی بزم قدرت کا ہوں میں

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

تقلید پرستی جسکا تعلق براہ راست مذہب سے ہوتا ہے انسانوں کو انسانیت کی معراج سے کھینچکر تنزل کی عمیق گھاٹیوں میں لے جاتا ہے یہ تقلید پرستی کا تخیل آہستہ آہستہ نسلوں کو برف کے تودے بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اُن کا ضمیر ذوقِ فکر سے خالی اور عمل سعی پیہم سے دور الگ اور بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے۔ اِسی تقلید کا دوسرا نام موت ہے اور اس کو علامہ نے خامشی سے تعبیر کیا ہے اور کہا ہے کہ ؎

یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر
زمین پر تو ہو۔ اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

چونکہ مذہب انسانوں کو اس پرستش کی حدود میں جکڑ کر رکھتا ہے اور دین ان رسیوں کو کاٹنے کا حکم دیتا ہے اور دین ہے علم و دانش کا تقاضا۔ در اصل اس تقاضے کا دوسرا نام ہے دین۔ لہٰذا جو قوم دین سے ہم آہنگ ہوگی وہ محبوبِ فطرت ہوگی۔ ؎

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن۔ محبوبِ فطرت ہے



ایسی قومیں جنکی زندگی بے رُوح ہو کر از سرِ نو صالحیت کے احساس سے سرد لہو کو حرارت عطا فرماتی ہے وہ اپنے تنزل سے ابھر کر عروج تک پہنچنے کے لئے اپنے ارادوں کو سہاروں کی رہینِ منت نہیں بنایا کرتیں ؎

ابھرا کرتے ہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنی مرہم کو

اس حساس قوم کے شاعر بے معنی باتیں کرنے میں اپنا وقت ضائع کر کے قوم کو شاعری کے الجھاؤ میں الجھا کر نہیں رکھتے بلکہ انکا فکر تباہیِ ملت سے متاثر ہو کر فلاحِ قوم کی تعمیر میں مستغرق رہتا ہے ؎

تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم با وضو رہنا

یہ شاعر قوم کو خودداری کی زندگی کی تعلیم دیتا ہے وہ مشاہداتِ

فطرت کے اشاروں سے زندگی کے خاکے کھینچتا ہے اور معراج خودی کا چراغ روشن کر کے بقائے دوام کی راہ دکھاتا ہے۔ اور کبھی زندگی گذارنے کے انداز اِس اسلوب میں بیان کرتا ہے۔ ؎

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیئے مثلِ حبابِ آبجو رہنا

کبھی وہ تاریخ کے اوراقِ پارینہ الٹتا ہے اور انتشارِ ملت کے نتائج کو تباہی و بربادی کے سانچوں میں ڈھال کر پیکرِ ذلت کے نقوش میں ظاہر کرتا ہے۔ کبھی وہ فردوں کی انفرادی زندگی دکھاتا ہے اور کبھی اس انفرادیت کو بحرِ بے پایاں کی شکل میں پیش کرتا ہے اور اس قسم کی مثالوں سے قومی زندگی کی وضاحت کرتے ہوئے زندگی کے نقطہ کو یوں بیان کرتا ہے۔ ؎

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے



اجتماعی زندگی میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو قطرے کی طرح ختم نہ کر دینا چاہیئے کہ اپنا وجود ہی نہ رہے اپنے وجود اور اپنی شخصیت کو قائم رکھنے کا نام خودداری ہے اور یہ بہت بڑا جوہر ہے جب تک انسان کا یہ جوہر نمود و چمک حاصل نہیں کرتا ستاروں کی محفل میں اندسی شخصیت حاصل نہیں کر سکتا۔ تنہا چاند ان گنت ستاروں

اور انکی بے شمار منور کرنوں میں بھی نمایاں طور پر اپنا وجود رکھتا ہے

زندگی کی رو میں سرگرداں ہے تو حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے سوزاں ہوں میں

لیکن یہ تمام چیزیں تابعِ تقدیر ہیں۔ چاند کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہ ہر رات کو اپنی روشنی عطا کرتا رہے۔ ستاروں میں یہ قوت نہیں ہے کہ جس رات کو چاند نہ ہو وہ بلکہ اپنی روشنی سے فضا کو منور کر دیں۔ سورج کے بس میں یہ نہیں ہے کہ شام کے بعد صبح تک ایک لمحہ کے لئے بھی رات کو نور عطا فرما سکے۔ لیکن انسان کے قبضہ قدرت میں ہے کہ وہ کائنات کا ہمدرد ہو جائے۔ دوسری مخلوق کی خدمت اور نگرانی کا ذمہ دار بنجائے۔ بنی نوع انسان کے لئے اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرے۔

پھر بھی اے ماہِ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے

جب تک عشقِ رسول اللہ کی تڑپ اور نیازِ مصطفٰے کی خلش سینے کے اندر چٹکیاں لے لے کر بیدار نہ ہو مسلمان ایک مٹی کے ڈھیر سے زیادہ نہیں ہے مسلم اور غیر مسلم میں فرق ہی یہی ہے کہ غیر مسلم خدا کے علاوہ دوسرے معبودوں کی پرستش میں مصروف رہتا ہے اور مسلم رسول اللہ کی محبت میں سوزاں رہتا ہے اس آرزوئے نیاز کا

نام نماز ہے اس تڑپ کا نام عبادت ہے اور اس خلشِ اندروں کا نام بندگی ہے۔ یہی ذوقِ دید حضرت بلال رضؓ کی نماز بنگئی تھی۔ ؎

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اذاں ازل سے تیرے عشق کا ترانہ بنی
نماز اسکے نظارے کا ایک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اسکا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اسکا



انسان اپنی زندگی میں کسی مقام کو بھی مقامِ سکوں قرار دے لے تو ٹھیک وہ مقام اُسکی موت کا مرکز بنجاتا ہے۔ اس لیئے کہ سعیِ پیہم وہاں پہنچکر خاموش ہو جاتی ہے۔ شور مرجاتا ہے جستجو مردہ ہو جاتی ہے۔ مزاجِ تغیر پسند کی تڑپ سو جاتی ہے۔ اور ان قوتوں کا خاموش ہو جانا متاعِ حیات کا لٹ جانا ہے۔ لیکن مردِ مومن اس متاعِ عزیز کی ہر لحجہ نگہبانی کرتا ہے اور وہ جنت کو بھی ٹھکرا کر جستجوِ عالم میں نکل آتا ہے۔ ؎

سنے کوئی میری غربت کی داستاں مجھسے
بھلایا قصۂ پیمانِ اولیں میںنے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میںنے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میںنے

ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میںنے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میںنے

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میںنے

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھکو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میںنے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آفریں میںنے

سنایا ہند میں آکر سرودِ ربانی
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میںنے

دیارِ ہند نے جس دم میری صدا نہ سُنی
بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میںنے

بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میںنے

لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میںنے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اِسی خیال میں راتیں گذار دیں میںنے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میںنے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقلِ دوربیں میںنے

کیا اسیر شعاؤں کو برقِ مضطر کو
بنادی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میںنے

مگر خبر نہ ملی آہ رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میںنے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میںنے



اس عالمِ وجود میں ان گنت انسان آتے ہیں۔ اس ساری کائنات کے تین گروہ ہو جاتے ہیں۔

(۱) جو قریب یعنی حال میں زندگی کو پُر لطف بنانا پسند کرتے ہیں
(۲) جو حال میں تکلیف اٹھا کر مستقبل کو خوشگوار بنانا بہتر سمجھتے ہیں
(۳) جو حال و مستقبل دونوں کو عمدہ بنا کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کے نزدیک جو لوگ حال پر قناعت کرتے ہیں آخرت یعنی ماضی میں ان کے لئے کچھ نہیں ہے اور وہ لوگ جنہیں مستقبل کی خوشگواری پسند ہے ان کا حال بھی عمدہ رہتا ہے اور تیسرے گروہ کے لئے دنیا اور آخرت دونوں زمانوں میں اللہ کا انعام ہے۔ یہی وہ گروہ ہے جو کبھی نہیں مرتا۔ موت ان کے جسم کو چھو سکتی ہے انہیں نہیں۔ اِسی کا نام زندگی ہے ورنہ مر کر ختم ہو جانے کا نام زندگی نہیں ہے۔

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل
کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل



انسانی قوتِ ادراک کے بل بوتے پر لاکھ چھان بین کر کے خود کو فریب دیکر عارضی اطمینان حاصل کر لیتا ہے لیکن اللہ تک پہنچنے کے لئے اس کی رُوح بیقرار رہتی ہے۔ وہ مشاہداتِ فطرت میں اُسے حاصل کرنیکی سعی کرتا رہتا ہے۔ برسوں جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہتا ہے لیکن وہ شئے اس کے اپنے اندر پنہاں ہے نہیں ملتی اس لئے کہ اسنے اپنی تحقیق کے لئے کوشش ہی نہیں کی اور وہ نہیں جان

سکتا کہ اس خاک کے نقاب میں وہ نور جلوہ افروز ہے

نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقابِ آگہی
ہے غبارِ دیدۂ بینا حجابِ آگہی

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے غفلت ہے سرمستی ہے بیہوشی ہے یہ

رُوح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس



جس طرح سے آدمی کے مرنے سے موت و حیات کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بعینہٖ اسلام کے نزدیک اجتماعی زندگی کا سلسلہ بھی کہیں منقطع نہیں ہوتا۔ انفرادی موت سے ملی موت نہیں ہو سکتی۔

جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی

جس کا نام خاتمہ ہے جسم کی موت سے روح پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بس اتنا ہوتا ہے کہ ہمارے ماحول میں اسکا وجودِ خاکی نہیں رہتا۔ جسقدر اسکی خودی نمود حاصل کر چکی ہوتی ہے اسی قدر اسکی زندگی بقا حاصل کر چکی ہوتی ہے۔

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

قرآنِ حمید نے مردِ مومن کی تعریف میں فرمایا ہے کہ خودی کی حفاظت کرتے کرتے خود تقدیرِ خدا بنجاتے ہیں یعنی وہ صفات جو خدا کی ذاتِ مقدسہ میں ہیں اس انسان کی فطرت میں سمو ہو جاتی ہیں پھر وہ مخلوقِ الٰہی کے لئے باعثِ رحمت بنجاتا ہے۔ اور واقعی انکی نگاہوں سے مردہ قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس انکی
الٰہی۔ کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں؟
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی۔ ارادت ہو تو دیکھ انکو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی۔ ہے انہی خلوت نشینوں میں



اسلام نے نہ تو رہبانیت کی تعلیم دی ہے اور نہ ہی اس تصور کی کہ یہ دنیا آدمی کے لئے قیامت تک کے واسطے مخدوم کر دی گئی ہے۔ آدم کے واسطے مخدوم ضرور ہے مگر ایک آدمی کے لئے نہیں اس لئے قدرت نے موت کا ایکدن معین کر رکھا ہے۔ چنانچہ اسلام نے زندگی بسر کرنے کے لئے درمیانی راہ بتائی ہے کہ لالچ اور ہوس سے الگ رہ کر اپنے حال اور مستقبل کے لئے ہمہ تن مصروف رہو۔ اس مصروفیت کا نام حیات ہے۔ خودی ہے اور مقصودِ زندگی ہے۔

یہی سعیِ پیہم نمود وظہور کی محتاجی سے بے نیاز کرتی ہے جیسے شبنم پھول کی محتاج نہیں ہے کہ اس پر نچھاور ہوتی ہے بلکہ پھول اسکے فیض کا محتاج ہے۔ شبنم اس کے درد کی دوا بنکر خود قریب آتی ہے اس جذبے کو جذبہ صالح کہتے ہیں۔ ؎

شبنم کی طرح پھولوں پہ رہ اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے

صلہ سے بے نیاز ہو کر دوسروں کے کام آنا ہی انسانیت ہے ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بیخبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

ہماری نظر میں اس پھول کی خودی بھی زندہ نہیں ہے جو شبنم سے تازگی کی بھیک مانگتا ہے۔ ؎

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے



اسلام کے نزدیک تڑپ کا دوسرا نام زندگی ہے۔ اور زندگی کا اصل مفہوم کسی نصب العین کے حصول کے لئے لگاتار کوشش ہے۔ جو انسان یا کوئی جماعت بغیر کسی نصب العین کے سانس لیتی رہے وہ حیوانات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ انسان اور حیوان میں تمیز ہی یہی ہے کہ وہ بغیر نصب العین کے وقت گذار

لیتے ہیں اور آدمی کسی مقصد کے حصول کی خاطر وقت کو استعمال میں لاتا ہے۔ انسان کے اندر وہ قوتیں ودیعت فرمادی گئی ہیں کہ اگر وہ صحیح انداز میں انہیں حرکت دے تو اس ساری مادہ کائنات پر قدرت حاصل کرسکتا ہے۔ وہ انسان جو وقت کا مطیع ہو کر چلے اس گھوڑے سے زیادہ نہیں جسکے منہ کی لگام سوار کے ہاتھ میں ہے۔ وقت کو اپنے مطیع کرے اپنی تڑپ کو سیمابی رُوح بخشنا عین حیات ہے

چشم نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیمِ خام ہے



اسلام کے نزدیک حرارتِ جستجو سے خمیرِ وجود کا گرم رہنا عین حیات ہے بشرطیکہ ذوقِ جستجو صالح ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ پست اقوام جب عروج و سطوتِ اقبال کی تلاش میں سرگرمِ عمل ہوئیں تو ان کے اندر سعیِ پیہم کی تپش پیدا ہوئی اور جب تک یہ تپش زندہ رہی تو قوم باعزت زندہ رہی اور جب وہ تپش خاموش ہوگئی ساتھ ہی وقار بھی خاموش ہوگیا اور ان پر ذلت یعنی موت تسلط ہوگئی۔ ؎

شمعِ سحر یہ کہہ گئی نور ہے زندگی کا ساز
غمکدہِ نمود میں شرطِ دوام اور ہے



اسلام کے نزدیک معراجِ خودی یہ ہے کہ انسان اپنی حیات کو خدا کے تابع کر دے چنانچہ زندگی کے تمام شعبے جب خدا کی رضا کے تابع ہو جائینگے تو انسان کی فطرت خدا کی فطرت بنجائے گی۔ جس طرح فولاد آگ میں رہ کر آگ کی خاصیت اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور وہی جلا دینے کا عمل اس میں آجاتا ہے جو آگ کا فطری فعل ہوتا ہے حالانکہ فولاد کی انفرادیت بھی قائم رہتی ہے اس طرح انسان خدا کی فطرت میں جذب ہو کر اپنے اندر وہی کیفیت لے آتا ہے جو اس کی قدرت ہوتی ہے۔ کلی بھی آفتاب کی شعاؤں سے زندگی حاصل کرتی ہے اور بُو علاوہ رنگ بھی اپنا لیتی ہے

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگین اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینہ زرین اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں
زندگی اسکی ہے خورشید کے پیمانے میں
سامنے مہر کے دل چیر کے رکھدیتی ہے
کسقدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے



چاند اگر مستقل طور پر اپنا مقام یا مرکز حاصل کر لے اور ایک صورت پر ٹھہر جائے تو اس کا سارا وقار ختم ہو جائے۔ مثلاً یہ رات کی بجائے صرف دن کو طلوع ہوتا رہے۔ یا صرف سرِ شام طلوع

ہو کر چھپ جایا کرے یا رات بھر چمکتا رہا کرے۔ آپ دیکھینگے کہ اس کے غیر مبتدل صورتوں سے کائنات پر طبعی طور پر کسقدر برا اثر پڑتا ہے۔ دراصل یہی حرکت اور بیقراری اسکی زندگی کی روح ہے۔ ؎

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا۔ کچل گئے ہیں



اسلام نے ملوکیت کی مخالفت کیوں کی تھی! اس لئے کہ اس نظام میں دین اور سیاست کی تقسیم ہو جاتی ہے اور یہی تقسیم مرگِ عروجِ ملت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ملوکیت میں دین محض مولوی طبقے کے سپرد رہا اور سیاست جس کا دوسرا نام سلطنت ہے۔ سلطان کے ذمہ رہی۔ مولوی نے عوام کو تحقیق سے باز رکھا اور کہا کہ ہر چیز کو بغیر تحقیق کئے مان لینے کا نام مذہب ہے۔ اور لوگوں سے مذہب اور دین کے فرق کو بھی چھپائے رکھا اس طرح سلطان کے کاروبار میں نکتہ چینی پیدا نہ ہوتے تھے۔ اس غلط تعلیم نے ملتِ

اسلامیہ کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ حالانکہ مسلمان کی مشت خاک میں تو ایک صحرا پنہاں تھا اور اس ہیرے میں ہزاروں رنگ بھر دیئے گئے تھے۔

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا مجھے
مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں
ہیں ہزاروں اسکے پہلو رنگ ہر پہلو کا اور
سینے میں ہیرا کوئی ترشا ہوا رکھتا ہوں میں
دل نہیں شاعر کا ہے کیفیتوں کی رستخیز
کیا خبر تجھکو درون سینہ کیا رکھتا ہوں میں
آرزو ہر کیفیت میں اِک نئے جلوے کی ہے
مضطرب ہوں دل سکون نا آشنا رکھتا ہوں میں

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر
حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں



کہتے ہیں کہ آج تک دنیا سے کوئی ایسا انسان نہیں گیا جس نے یہ کہا ہو کہ میری تمام آرزوئیں مکمل ہو گئی ہیں۔ ہر شخص تشنۂ آرزو رہتا ہے اور تشنگی کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ زندگی کی میعاد بہت کم تھی اور کام بہت تھے۔ لیکن اسلام کے نزدیک یہی تشنگی سعی پیہم کا باعث ہے۔ اور یہی سعی پیہم روحِ حیات ہے۔

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے



اسلام کے نزدیک حیات ایک جوئے رواں ہے کہیں نہ

رکھنے والی کہیں نہ تھمنے والی۔ مسلسل اور مستقل رواں رہنیوالی اور یہ روانی اُس حالت میں قائم رہ سکتی ہے جب کہ اس کا سلسلہ قائم رہے اور سلسلہ بھی قائم رہ سکتا ہے جب ایک نصب العین کے بعد دوسرا نصب العین پیشِ نظر رہے۔ زندگی کی موت کا وہ مقام ہے جہاں پہنچکر انسان حصولِ تمنا کا سلسلہ منقطع کر دے اور شکست خوردہ ہوکر بیٹھ جائے۔ اگر نظر کے سامنے ستاروں کی طرح اَنگنت حسرتیں ہیں تو اسی قدر دامنِ حصول کو وسعت دینی چاہیئے۔ ؎

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اس سے قائم ہے شان تیری
حضورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا



لفظ موت ہماری روزمرہ کی زندگی میں بمعنی فنا کے ہیں۔ انسان کے جسم سے روح کا تعلق سانس تک وابستہ ہے جبتک دم کا سلسلہ جاری و ساری رہے رُوح کارفرما رہتی ہے جونہی یہ دم یعنی یہ ہوا کی موج الگ ہوئی جسمانی زندگی کا سلسلہ منقطع ہوا۔

زندگی انساں کی اِک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے۔ دم کے سوا کچھ بھی نہیں

بعض کے نزدیک تکمیلِ آرزو کا نام زندگی ہے۔ وہ مسلسل کوششوں کے بعد جب اپنا مقامِ آرزو جا پہنچے ہیں تو خوش ہو کر کہتے ہیں کہ آج زندگی کا نیاز حاصل ہوا۔ حالانکہ اس حصول سے

نصب العین کو موت آچکی ہوتی ہے ۔ گل چٹک کر سینۂ بے آرزو ہو جاتا ہے لیکن شمع کی حیات مسلسل گریہ سے وابستہ رہتی ہے اِس لئے کہ اسکا نور زندہ ہوتا ہے ۔

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر شمع بولی ۔گریہ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

جس وقت تک انسان اس رازِ موت و حیات سے آگاہ نہیں ہوتا یہ راز راز بنکر رہتا ہے اور جب آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر اس راز کے پردے میں اپنے آپکو دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے ۔

رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

وجود کو حیات عطا فرما دی گئی ہے ۔ اور حیات پر اجل مسلط کر دی گئی ہے ۔ لیکن وہ قومیں جو اجتماعی زندگی کے دائرے میں زندگی بسر کرتی ہیں کبھی فنا نہیں ہوتیں ۔ اجل صرف اس قوم کے افراد کو چھو سکتی ہے قوم کی اجتماعی زندگی تک اسکی رسائی نہیں ہوتی ۔ کیونکہ یہ افراد ان گنت تاروں کی طرح اپنی تابانیوں کو یکجا کر کے آفتابِ درخشاں کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں اور ستاروں کی موت دراصل مہرِ درخشاں کی زندگی کا سبب بنتی ہے اِس لئے اسے موت نہیں کہا جا سکتا ۔ موت اس قوم پر غالب آتی ہے جسکے افراد منتشر ہوں جسکا ایک مرکز نہو ۔ جسکا ایک نصب العین نہو ۔

جسکا ایک پلیٹ فارم ہو ۔ لیکن جو شاہین کی طرح تمام فضا میں گھوم کر نگاہ مرکز پر رکھتے ہیں وہ اجل سے بے نیاز ہوتے ہیں ۔ سحر ستاروں کی موت نہیں بنتی بلکہ مہرِ صبح کو مئے حیات پلاتی ہے ۔

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے



انسان کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس پیام کو جو لیکر آیا ہے عام کرے اور اپنے بھیجنے والے کا مقصود جہاں کے گوشے گوشے تک پہنچائے ۔ یہ کام معمولی نہیں ۔ یہ راہیں آسان نہیں ہیں خلافت کا سارا بوجھ اسکے کندھوں پر ڈالدیا گیا ہے ۔ پاسبانی عالم کی تمام ذمہ داری اس کے سپرد کر دی گئی ہے ۔ اور اتنے بڑے کام کے مقابلہ میں زندگی کو اس قدر کم مہلت دی گئی ہے کہ الامان ۔ ؎

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا ۔ اُڑ گیا

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپید اکنار
اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار

اے ہوس خون رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار
یہ شرارے کا تبسم ۔ یہ خسِ آتش سوار

اسلام کے نزدیک فطرت کا قتلِ عام قتل و غارتگری نہیں بلکہ تعمیر نو کے سامان ہیں - جس طرح شاخ سے ایک ایک پھول کو توڑ کر بظاہر ان کا قتلِ عام کرکے گلدستہ کی حیاتِ نو کے تعمیری حسن میں اضافے کیے جاتے ہیں اس طرح اگر چھوٹی شخصیتیں ایک بڑی اور اہم شخصیت کی نمود کے لئے فنا ہو جائیں قربان ہو جائیں یا بچھاور ہو جائیں تو ان کا خاتمہ قابلِ افسوس نہیں ہوتا - ؎

اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار
رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں
دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار
ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو



وہ قوم اور اس قوم کی ایسی حکومت جس کی عمارت ملوکیت کے گارے چونے سے استوار کی گئی ہو جس کی بنیاد سلطنت کے پتھر پر رکھی گئی ہو ثبات حاصل نہیں کر سکتی - اس لئے کہ اس کی یہ زندگی اور اس زندگی کا وہ دستور غیر فطری ہوتا ہے. فطری

دستورِ حیات جب بھی غیر فطری دستور کا جامہ پہنکر جلوہ افروز ہوگا اسکی تابانی چراغِ سحری سے زیادہ بقائے دوام کی حامل نہ ہوگی۔ ؎

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہگذر
چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور
مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں
دفترِ ہستی میں انکی داستاں تک بھی نہیں
آدبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے
عظمتِ یوناں و روما لوٹ لی ایام نے
آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسماں سے ابرِ آزاری اٹھا۔ برسا۔ گیا



فکر و غم ایک ایسی متاعِ حیات ہے جس کے لٹ جانے سے نہ ہونے سے یا کم ہو جانے سے زندگی میں نشاط و کیف کے لمحات تو داخل ہو جاتے ہیں لیکن ان لمحات کے پاؤں تلے جوہرِ زندگی کس طرح کچل کر رہ جاتا ہے نشاط و مسرت کا طالب دیکھتا ہی نہیں کم نگاہی اِس مسرت و خوشی پر والہانہ جھومتی ہے اور اس کے تباہ کن نتائج سے غافل رہ کر دردِ دل کو فروخت کر دیتی ہے۔ ؎

گو سراپا کیف عشرت ہے شرابِ زندگی — اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی
موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی — ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی
آرزو کے خون سے رنگین ہے دل کی داستاں
نغمہ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے — رُوح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال — غازہ ہے آئینہ دل کیلئے گردِ ملال
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے — ساز یہ بیدار ہوتا ہے اِسی مضراب سے
طایرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل ۔ غم انکشافِ راز ہے



غروبِ آفتاب پر شام کی فتحیابی کے اغراز بین اجل تبسم ریز ہوتی ہے جیسے کسی گمراہ قوم کی تباہی پر دشمن کی قوت مذاق اڑائے ۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں کہ جس طرح بالیوں کے اندر دانوں کی پختگی کھیتی کی موت کا سبب بنکر دانوں کی حیاتِ نو کا مقصد بنجاتی ہے اور پھر ایک دانے کی ہستی خاک میں ملکر سبز و شاداب زندگی کا لباس پہن کر نمودِ حیات حاصل کرتی ہے ۔ اسی طرح ایک قوم جب صراطِ مستقیم سے ہٹ کر غلط راہیں اختیار کرتی ہے تو تباہی کی جانب رواں ہو جاتی ہے لیکن یہی غلط راستے اس کی منزل کے چراغِ راہ بنجاتے ہیں جب اسے غلط روی کا احساس پیدا

ہوتا ہے تو اس قوم میں شعور پیدا ہوتا ہے دنیا اسے شام زندگی پر شرارے کی آخری چمک سمجھتی ہے لیکن یہی شام طلوعِ سحر کے استقبال کے نئے سامان پیدا کرتی ہے۔ ؎

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں
رُوح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں



کسان جب بالیوں سے دانے نکال کر الگ کرتا ہے تو بالیوں کو واقعی صدمہ پہنچتا ہے۔ دانے پروردۂ آغوش ہوتے ہیں انہیں بھی غمِ جدائی بیتاب رکھتا ہے لیکن یہ دونوں حیات نو کے اسرارِ پنہاں سے آگاہی نہیں رکھتے۔ لیکن جب دانہ خاک میں ملکر پھر بالیوں کی آغوش میں آتا ہے تو اپنی اس خردِ خام پر مذاق اڑاتا ہے۔ ؎

پستیِ عالم میں ملنے کو جدا ہوئے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

قوموں پر موت اس وقت مسلط ہوتی ہے جب ان کے اندر سے انکا قومی کردار ختم ہو جاتا ہے۔ قومی کردار چراغ کا تیل ہوتا ہے۔ چراغ میں جب تک تیل کار فرما رہتا ہے لَو میں روشنی زندہ رہتی ہے اور اس زندگی کا دوسرا نام نور ہے۔ جس سے ظلمات کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ چراغ میں تیل بھی ہوتا ہے لیکن کسی ہوا کے تیز جھونکے سے بجھ جاتا ہے اُسکی روشنی ختم ہو جاتی ہے لیکن درحقیقت رُوحِ نور ختم نہیں ہوتی اُسے ماچس دکھایئے لَو پھر منور ہو جائیگی۔ گویا بجھ کر بھی اپنے سینہ میں نور کی قوت کو بیدار رکھتا ہے۔

وادیٔ ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو
مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں



عیسائی قوموں نے مسلمان کے ذہن میں وطن کا تصور کچھ اس طرح نقش کیا کہ یہ بھی ہندو کے دوش بدوش ہو کر زمین بھارت اور دیش کے ترانے گانے لگا۔ یہی وہ نغمہ تھا جس سے

تعصب پیدا ہوا اور مسلم نظریہ وطن کو اسقدر محدود کرتا چلا گیا کہ خود اسلام مقید ہو کر رہ گیا۔ مغربی تمدن نے سب سے پہلے اسکی صناعی کی اور بالخصوص مسلمان کو اسکا پجاری بنایا۔ مسلمان کے پجاری بننے سے تمام غیر مسلم اقوام کی چاندی تھی۔ مسلمان وطن کی قید و اسیری میں محدود ہو گیا اور دوسری اقوام اِس پر غالب آگئیں۔ ؎

یہ بُت کہ تراشیدہ تہذیبِ نوی ہے
غارتگرِ کاشانہ دینِ نبوی ؐ ہے

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ؐ ہے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

حضرت ابراہیم ؑ کے سینۂ منور میں جب نیازِ حق تعالےٰ کی آرزو بیدار ہوئی انکی مقدس نگاہوں نے مشاہداتِ عالم میں تلاش فرمائی۔ انہوں نے طلوعِ سحر کی زرین تابانیوں میں نورِ وحدت کو دیکھنے کی کوشش فرمائی اور سمجھا کہ یہی آفتابِ عالمتابِ ظہورِ الٰہی ہے (نعوذ باللہ خدا ہے) لیکن مستقل گردش نے شام کی آغوشِ

تاریک ہیں اسے غروب کرکے آپ نے تخیل کی تردید فرما دی۔ پھر چاند کا ظہور ہوا تو انہوں نے رات کو منور کر دینے والے چاند کی قوت کو خدا سمجھا مگر اسے بھی ناپائیدار پایا۔ پھر ستاروں کی محفل میں جلوۂ یار کی جستجو کار فرما رہی مگر بے ثباتی نور نے تخیل کو ایمان کی پختگی نہ دی۔ اور آخر انہیں ان سب پر قدرت رکھنے والا ملا۔ اور آپ نے ہر نگہِ غلط کو تبلیغ فرمائی۔ ؎

تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خامشی میں
پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں

ملتِ اسلامیہ سے جب اللہ کا انعام (حکومت) چھن گیا تو وہ بے راہ ہو کر رہ گئی۔ پھر اسکی نگاہیں جھوٹے نگیں کی تابانیوں کو نورِ حقیقت سمجھنے پر مجبور ہو گئیں۔ انگریز حاکم تھا اور ملتِ اسلامیہ محکوم۔ اس قوم نے حاکمِ وقت کی تہذیب اسکا تمدن اور اسکی معاشرت کے سامنے سر جھکا دیا۔ پہلے اسکا ظاہر پسند کیا اور اپنا لیا لیکن ستم یہ ہوا کہ یہ بے راہ قوم حاکم کا اخلاق تو لے نہ سکی اپنا اخلاق بھی گنوا بیٹھی۔ نہ یہ قوم مسلمانوں کی قوم رہی نہ اِسکے افراد انگریز بن سکے۔

؎ آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

(زبانِ ازنا)

یہ قوم خیالات۔ اطوار اور تمدن کے لحاظ سے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوئی کہ سارا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اور اس حقیقت کو زنگ آلود کر کے بیٹھ گئی۔

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

اسلام میں صالح زندگی کو انعام کہا گیا ہے اور یہی انعام حکومت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس انعام کا دوسرا نام احسان ہے جو صرف اللہ کی جانب سے کسی قوم پر ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ انعام و احسان حاصل کر لینے کے بعد اگر کوئی قوم اپنی بہبودی کے لئے سعیٔ پیہم سے کام نہیں لیتی تو یقیناً وہ احسان فراموش ہے اور احسان فراموشی بلاشبہ ایک جرم ہے اور جرم کی سزا مجرم کو لازم آتی ہے اس لئے کہا گیا ہے کہ زندگی میں ملی نصب العین قائم کر کے اسکے حصول کے لئے ہر ممکن قدم اٹھانا چاہئے اور ایک لمحہ بھی غفلت میں نہیں گذارنا چاہیے۔ کیونکہ ہمیں وقتِ معین کا علم نہیں ہے۔ کب ہمارا معین وقت اپنی انتہا کو پہنچ جائے ہمیں آگاہی نہیں ہے۔ اِسلئے وقت کی رفتار کے ساتھ حصولِ نصب العین کی رفتار کو دوش بدوش رکھنا چاہیے۔ جس قدر کوئی رفتار تیز سے تیز تر ہوگی دیکھنے والی آنکھ اس کا جائزہ نہ لے سکے گی۔

میںنے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش



نگہِ بشر کے علاوہ کائنات میں ہر آنکھ مجبورِ تماشا ہے۔ وہ مناظرِ قدرت دیکھتی ہے اور دیکھ کر خموش رہ جاتی ہے اسکی فطرت میں قوتِ استفسار کی روح نہیں ہے۔ لیکن انسان کی آنکھ منظرِ فطرت کو دیکھ کر خموش نہیں رہتی بلکہ محقق بنکر اس کی تحقیق میں سرگرم عمل رہتی ہے کہ یہ رنگ و بو کہاں سے اور کیوں ہیں ؟

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے

ہر شے اپنی محدود دنیا میں خوش ہے بلکہ اور سمٹ کر ماحول کو سمٹانا چاہتی ہے حتےٰ کہ سمندر کی موج ساحل سے وصال کرکے فنا ہو جاتی ہے۔ لیکن انسان موج کو دریا اور ذرے کو صحرا بنا دینا چاہتا ہے۔ ؎

اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہردم
یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئتِ چمنستاں کی
یہ ہستیِ دانا ہے۔ بینا ہے۔ توانا ہے

اسلام میں اپنی زندگی کی حفاظت کی تاکید کی گئی ہے۔ عام لوگوں کا نظریہ ہے کہ اسلام نے طبعی طور پر حفاظتِ حیات کی تاکید فرمائی ہے اور یہاں تک اجازت ہے کہ جان بچانے کیلئے سور کا گوشت بھی حلال ہے۔ مان لیا کہ یہ نظریہ بھی عین اسلامی ہے لیکن جان کو بچا کر جان کے مفہوم و مقصود کی حفاظت بھی کوئی چیز ہے۔ جان کو بچانے کا مقصد مقصودِ جان کی حفاظت ہے ورنہ حیوانی زندگی کی حفاظت چنداں ضرورت نہیں رکھتی۔ مثلاً ایک مسلمان عین احکامِ الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور اسکے دم کے ساتھ بہت سے ملی مفاد وابستہ ہیں تو اس کی جان بڑی محترم و عزیز ہے لیکن دوسرا مسلمان صرف دنیاوی زندگی تک محدود ہے اور ذاتی اغراض کے لئے سانس لیتا ہے تو اس کا جینا اور مرنا برابر ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقصودِ حیات کیا ہے اور اس کی حفاظت کس طرح کی جا سکتی ہے؟
مقصودِ حیات ہے نصب العین کے لئے سعی پیہم کا تسلسل اور اسکی حفاظت خودی کی حفاظت سے ہو سکتی ہے۔ ؎

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشین کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار ۔ وہ کردار ۔ تو ثابت وہ سیارا

اسلام نے وراثت ارضی سے محرومی کے اسباب واضح طور پر بتا دیئے ہیں اور کہدیا ہے کہ جس قوم میں فرقہ آرائی کے زہریلے جراثیم پیدا ہو جائینگے اسکی ملی ساخت کو دیمک لگ جائے گی۔ بالکل یہی حال ہماری ملتِ اسلامیہ کا ہوا ۔ سب سے پہلے اس ایک ملت میں فرقے پیدا ہوئے پھر پھوٹ جو اس کا لازمی نتیجہ ہو سکتا ہے ظہور پذیر ہوئی ۔ ہمارے مقابلہ میں دوسری قومیں یکجہتی کی وجہ سے بہت آگے نکل گئیں ۔ ؎

قافلے دیکھ اور انکی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ انکی گرفتاری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ

بغیر خون کے باغِ ملت کی سیرابی غیر ممکن ہے ۔ لیکن یہ خون انفرادی طور پر بیکار رہتا ہے اور جب یہی خون اجتماعی طور پر بہلیا جائے تو بہار کی سینہ تشگافی کرتا ہے ۔ بغیر قربانی دیئے منزلِ

آزادی کی راہیں کشادہ نہیں ہوتیں۔ اور جب قربانیاں دیدی جاتی ہیں تو پھر غلامی کے تار و پود خودبخود ٹوٹ جاتے ہیں اور آزادی کی صبح طلوع ہوتی ہے۔ ؎

گل بدامن ہے میری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا تیرا

مومن کو اللہ تعالےٰ کی ذاتِ بابرکات نے زمین پر بحیثیت نائب الہٰی بھیجا تھا اور جہانبانی کی ذمہ داری اس کے سپرد کردی گئی تھی لیکن آج یہ ساقی خود بھی تشنہ کام ہے چہ جائیکہ اسکی محفل سیراب ہو۔ ؎

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے؟
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا تیرا

یہ ساقی تشنہ اس لئے رہ گیا ہے کہ اسنے اپنے ہاتھوں انسانیت کے جام مۓ توحید سے خالی کر دیئے اور اب سرگرداں ہے کہ کہیں سے پھر وہی جام صحت ہاتھ آجائے۔ ؎

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بتخانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا تیرا

آج مسلمان پھر اُس عروجِ رفتہ اور فردوسِ گم گشتہ کا متمنی و متلاشی ہے جس کا یہ وارث تھا جو اسکی ملکیت تھی جس پر اسکا حکم رواں تھا۔ چاہتا تو ہے کہ پھر وراثتِ ارضی کا انعام ملجائے

لیکن یہ چیز فقط چاہنے سے ہی نہیں ملجاتی - اسکا تقاضا صالحیت ہے جبتک قوم میں مجموعی طور پر صالحیت نہیں آجاتی یہ انعام نہیں مل سکتا - اسکی مثال اُس چراغ کی سی ہے جس کے سینے میں تیل تو نہ ہو اور وہ نور کی تمنا رکھتا ہو - ؎

قیس پیدا ہوں تیری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا تیرا محمل ہے بے لیلیٰ تیرا

اے ذرِ تابندہ اے پروردۂ آغوشِ موج
لذتِ طوفان سے ہے نا آشنا دریا تیرا

اُس وقت تمنا ایک حسرتِ ناکام کے سوا کچھ اہمیت نہیں رکھتی جبکہ چراغ کا تیل ختم ہو چکا ہو اور فضا کو روشنی کی ضرورت ہو - آج جبکہ ہماری قوم قطعی بے کردار ہو چکی ہو - اِسے باکردار ہونیکا احساس ہوا ہے -

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشان ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا ؟

پانی میں مٹھاس کیسے آسکتی ہے جب چشمہ کے سینے میں تلخی موجود ہے - لاوے کے دہانے سے برف آب کی توقع ایک فریب نہیں تو اور کیا ہے - ہماری ملتِ اسلامیہ اس وقت تک کبھی صالح نہیں ہو سکتی، جب تک اسکا امیر صالح نہ ہو - جس انداز سے امیر جماعت زندگی کے نمونے پیش کرے گا قوم اسے لبیک کہیگی آج

اول تو اس قافلے کا امیر ہی کوئی نہیں ہے اور جسے دعویٰ ہے وہ میزان پر پورا نہیں اترتا۔ ؎

شمع محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا،
تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے

یہ امیرِ جماعت یہ قائدِ ملت شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ایک دن اللہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا کہ ہماری عطا کردہ قوتوں سے تم نے کیا فرائض انجام دیئے۔ اور یہ پوچھا جائے گا۔ ؎

رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشان کیوں تیری تسبیح کے دانے ہوئے

آج ملت کی مجموعی حالت اسقدر تباہ ہو چکی ہے کہ نہ تو خود سنورنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ صلاحیت کا سبق لینے کی متحمل ہے۔ ؎

شوق بے پروا گیا۔ فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے رہے نہ فرزانے رہے

عوام کے بدلے ہوئے احساسات اور دینی تغییر کو دیکھ کر ایک مبہم سی امید کی جھلک دکھائی ہے کہ اس شبِ ظلمات کے پیچھے سحر انگڑائی لے رہی ہے۔ حکومت پاکستان نے دستورِ نو کے ساز چھیڑ کر عوام کی توجہ کو ہمہ گیر تو کر لیا لیکن انکی روحانی تشفی

کے سامان فراہم کرنے میں ابتک کامیاب نہیں ہوئی۔ عوام اسلامی دستورِ حیات کے خواہاں ہیں اور ملک کے گوشے گوشے سے مطالبے پیش ہو رہے ہیں کہ مملکتِ خداداد پاکستان کو حکومتِ الٰہیہ کی شکل میں متشکل کیا جائے اور اس سرزمین پر قانونِ ابدی نافذ کیے جائیں حکومت نے ایک چراغ روشن کرکے پروانوں کو جمع تو کرلیا ہے لیکن انکی زندگی کا سامان پیدا نہیں کیا کیونکہ یہ چراغ کرشمہ سازی کا شعبدہ ہے۔ ؎

وہ جگر سوزی نہیں وہ شعلہ آسامی نہیں
فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے؟

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

غلامی فطرتِ آزادی کو زنگ آلود کردیتی ہے۔ لیکن وہ ہر پرندہ جو قفس میں رہ کر بھی شعورِ فطرت سے بے حس نہیں ہوتا زندگی کی نظر میں زندہ و آزاد ہے کیونکہ اسکی فکر زندہ ہے اسکی سعی و کوشش سلامت ہے اُسکے سینہ میں سوز کارفرما ہے۔ مگر وہ جو ایک بار پھڑپھڑا کر زخم خوردہ ہو کر خاموش ہوگیا ہے اسکی ہمت پر فکرِ آزادی نالہ کناں ہے اسکے استقلال پر سوزِ حریت ماتم کرتا ہے۔

؎ رہزنِ ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تُو۔ گلشن میں مثلِ بُو ہوا

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشان کاروانِ بو ہوا

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا

اُس طائرِ بے حس کی آزادی کا ایک ہی علاج ہے کہ وہ اپنے اندر پھر سے وہ نور پیدا کرے۔ وہ نصب العین زندہ کرے جسکے حصول کا دوسرا نام آزاد زندگی ہے۔ ے

پھر کہیں سے پیدا کر اسکو بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

پنکھڑی اُسی حالت میں پیاری لگتی ہے جب تک اسکا رشتہ پھول کے جگر گوشوں سے وابستہ و پیوستہ رہے۔ ورنہ انفرادی طور پر ایک پنکھڑی کوئی قیمت اور وقعت نہیں رکھتی۔ ے

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

ایک قطرہ جب دریا میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے تو پھر دریا کہلاتا ہے اور جب دریا سے الگ ہوتا ہے تو قطرہ سے زیادہ نام نہیں پا سکتا اور ایک گرم ہوا کا جھونکا اسکی تر و تازگی کو فنا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسکے مقابلے میں عمر بھر ہوائیں چلتی رہیں دریا کو خشک نہیں کر سکتیں۔ ے

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں ۔ اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مسلمان جو آج تباہ حال ہے اور اپنی اصل زندگی کو ترس رہا ہے بیچارہ ایک مریض بنکر رہ گیا ہے اور مرض کی دوا مغرب کے حکیموں سے مانگ رہا ہے حالانکہ خود ہی دوا ہے اور آپ ہی علاج ۔

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو
کانپتا ہے دل تیرا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچہ چاک گریباں میں کبھی
قیس تو لیلا بھی تو صحرا بھی تو محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بنکر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو



مسلمان یہ بھول ہی گیا کہ یہ خود ساری کائنات کا مداوا ہے انسانوں کے دکھ کی دوا ہے ۔ دنیا کے درد کا علاج ہے ۔

گمراہ قوموں کا ماویٰ و ملجا ہے ۔ بھولے بھٹکوں کے لئے چراغِ راہ ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفان بھی ہے
سینہ ہے تیرا امین اسکے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیرِ بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے



اسلام سے پہلے دنیا کے ہر فرقہ نے اپنے تخیل اور معراجِ فکر کے مطابق اپنا اپنا الگ خدا بنا رکھا تھا ۔ جس سے نظامِ فطرت کی برہمی کا اندیشہ غالب تھا اور یکجہتی کا فقدان نظر آرہا تھا ۔ فطرت نے مسلمان کو توحید کی صداقت کے لئے بھیجا تاکہ کائنات کی تعمیر اور قدرت سے اسکے قادر و معمار کی وحدت کو تسلیم کیا جائے ۔

حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا
اور مجھے اسکی حفاظت کے لئے پیدا کیا

جہاں بانی کے علاوہ جہان داری کی دولت بھی عطا

فرمادی گئی گویا دربان کو اِس گھر کا مالک بھی بنا دیا گیا اور معراجِ عنایت سے گھر کی قسمت کے فیصلے بھی اسکے سپرد کر دیے گئے۔

؎ قسمتِ عالم کا مسلم کوکبِ تابندہ ہے
جسکی تابانی سے افسون سحر شرمندہ ہے



عموماً لوگ ایک شعر کہنے والے کو ایسے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ اسے اپنی محدود حدِ نگاہ میں مقید کر لیتے ہیں اور محض شاعر سمجھ کر اس سے یوں کنارہ کش ہو جاتے ہیں جیسے ربطِ ملت سے اسکا کچھ واسطہ ہی نہ تھا حالانکہ اِس زمرہ میں ایسے سخن گو بھی ہونگے جنکا ایک جملہ قوم کی ذہنیت کو جلد عطا فرمادے اس لئے دیکھنا یہ چاہیئے کہ کہا کیا ہے یہ نہیں کہ کہنے والا کون ہے

؎ شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اسکے فیض سے مزرعِ زندگی ہری

شاعرِ ملت کا فرضِ اولیں ہے کہ وہ ذہنی عیاشی کے سامان کو سپردِ آتش کر دے اور اپنے تخیل اور فکر کو بہبودیِ ملت کے لئے صرف کر دے اگر یہ حکیم خود پیامِ الٰہی بنجائے اور نشر و اشاعت کا ذریعہ بنجائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسکی قوم کے دل و دماغ بدل جائیں

؎ شانِ خلیل ہوتی ہے اسکے کلام سے عیاں
کرتی ہے اسکی قوم جب اپنا شعارِ آذری

اہلِ زمیں کو نسخہ زندگی دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

اسلام نے مسلم زادیوں کے لئے غیرت مقدم کر دی ہے بلکہ فطرت نے مقدر کر دی ہے۔ سب سے پہلے اسلام نے عورت کے دامن میں غیرت کے جواہرات بھرے اسکی نگاہوں کو حیا کی تعلیم دی اسکے قلب میں شرم و غیرت کا چراغ روشن کیا۔ پھر اسی جوہر کا دوسرا نام نسانیت رکھا اس مقدس عطیہ کا احترام کیا گیا۔ جب تک یہ جذبہ عورت کے رگ و پے میں موجزن رہتا ہے عورت میں عورت پن کار فرما رہتا ہے۔ جونہی یہ چمک الگ ہوئی یہ موتی بے آب ہوا۔ غلام قادر رُہلیہ نے اسی جوہر کو آزمانے کے لئے تیمور کی بیٹی کو پرکھا تھا جب انکی جراتِ انتقام سرد ہوگئی تو رُہلیہ نے انہیں بے غیرت کہکر ذلیل کر دیا۔ اور کہا۔ ؎

یہ مقصد تھا میرا اِس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

اسلام میں ارتقا کا مفہوم معراجِ النسانیت ہے۔ اِس

معراج کی مختصر تفسیر یہ ہے کہ مومن شعلہ معراجِ انسانیت ہو۔ غیور اور شور انگیز رہے ۔ مومن پر سکوت حرام ہے اور کشاکش پیہم حلال ہے ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

حیاتِ شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اسکی ہے مشکل کشی جفا طلبی

سکوتِ شام سے تا نغمہ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی

کشاکشِ زم و گرما تپ و تراش و خراش
زخاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشہ حلبی

مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیساں و آتشِ عنبی

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

مسلم سلطنت کے دور میں دین اور سیاست کی تقسیم ہوئی ۔ سلطان کی بقا اسی میں تھی کہ وہ عوام کو دین سے الگ کرکے سیاست سے الگ رکھے ۔ سلطان بہ حیثیتِ سلطان اسی حالت میں زندہ رہ سکتا تھا کہ جب تک وہ عوام کو اسلامی حکومت و سلطنت کے مفہوم سے قطعی بے بہرہ رکھے اور یہ کوئی آسان بات نہ تھی چنانچہ اسنے اہل دین (مولوی) کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ عوام کو اس انداز سے دین کی تعلیم دے کہ وہ سلطنت سے دور رہیں اس شطرنج نے مسلمان کی ذہنی بازی کو جیت لیا چنانچہ مسلمان اپنے دین سے کٹ کر ایک عجیب مذہبی دنیا میں ڈال دیا گیا اس دور کے بعد جب انگریز کا دور آیا تو وہ اس قوم کو بے راہ پاکر خوش ہوا اور اُسنے آسانی

سے اسے اپنی تہذیب میں سمو لیا جس سے مسلمان کی رہی سہی شخصیت
بھی ختم ہو گئی ۔ لیکن مسلمان نے اس کو حیاتِ تازہ سمجھا ۔ ؎

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت خود فروشی ناشکیبائی ہوسناکی
فروغِ شمعِ نو سے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی
مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی

تو اے پروانہ ایں گرمی ز شمعِ محفلے داری
چو من در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلے داری

ہر سعیِ مسلسل تازہ دم ہونے کے لئے ایک مقام پر ٹھہرتی ہے ۔
صرف ٹھہرتی ہے رکتی نہیں اس خیال سے اسکا سلسلہ منقطع نہیں ہو
تا ۔ جیسے آدمی تھکا ماندہ سو جائے تو یہ نیند زندگی کے تسلسل میں خلیج
پیدا نہیں کرتی زندگی کا سلسلہ جوئے رواں کی طرح جاری وساری
رہتا ہے ۔ ؎

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جسکا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اسکو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں



موت بیشک ایک قوت ہے جسکے اثر سے زندگی تسخیر ہو جاتا ہی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی جیسے بلبلے کہ ہوا کی قوت سے مٹ کر اپنی زندگی سے پھر ابھرتے ہیں۔ اگر موج میں دوبارہ بلبلے پیدا کرنیکی صلاحیت نہ ہوتی تو ہوا کی قوت کو ہم واقعی موت کہہ دیتے اور موت کا نام فنا رکھدیتے مگر ایسا نہیں ہے۔

آہ غافل موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے

جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوائے بالائے آب
موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

موج کے دامن میں پھر اسکو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بیدردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اسکے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اسکو جستجو رہتی نہ ہو

پودے کا بیج منوں مٹی کے نیچے دب جاتا ہے چونکہ اسکی فطرت زندہ ہوتی اس لئے یہ مٹی کا دباؤ اسے دبانے میں ناکام رہتا ہے وہ زیرِ خاک آنکھ کھولتا ہے پھر خاک کا سینہ چیر کر سر بلند ہوتا ہے اور زندگی کی نشو دنما حاصل کرتا ہے۔ ؎

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بیخواب ہے
کسقدر نشو دنما کے واسطے بیتاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی خود فزائی کے لئے مجبور ہے

سردیِ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

پھول بنکر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

ہے لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اِک پیغام ہے

ہمارا آج کا مسلمان اسباب زوالِ امت کے بارے میں بڑی بیباکی سے کہتا ہے کہ اگر زندگی کی راہیں صرف قرآن کریم ہی میں محفوظ ہیں تو پھر اقوامِ دیگر کیوں سربلند ہیں۔ اگر یہی ہے کہ ہمنے اللہ اور رسول ؐ کے احکامات کی پابندی سے منہ موڑ رکھا ہے تو اقوامِ دیگر نے اُس رسی کو کونسا مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے پھر وہ حاکم اور ہم جو پھر بھی مسلمان ہیں محکوم کیوں ہیں۔ یہ ایک بہت لمبی بحث ہے۔ یہاں ہم صرف اسے دو لفظوں میں ختم کرینگے کہ ہماری ملتِ اسلامیہ نے غمِ فردا سے بے نیاز ہو کر مستقبل کے لئے کچھ نہیں سوچا اس مستقبل کا نام آخرت ہے اِسنے آخرت کے معاملے خدا پر چھوڑ دیئے ہیں اور انگریز قوم نے فکر سے مستقبل کو زیرِ بحث رکھا ہے۔ اِس لئے اسے دنیا و آخرت دونوں پر قابو ہے ہمنے اُس قوم کی صرف ظاہری حالت کو دیکھا ہے اسکے عمل کو نہیں دیکھا۔ پھر حقیقت یہ ہے کہ اسکا یہ عروج بھی دائمی نہیں ہے اِسلئے کہ فطری اصولات کے تحت نہیں ہے۔

؎ اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ؐ ہاشمی

انکی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اسلام زندگی کے شعبوں کو استقلال ہمت ۔ عزم ۔ اور سعیِ پیہم کی تعلیم دیتا ہے ۔ اِسکے ساتھ اسلام نے مسلمان کو علم و فن کے خزانوں کا وارث مقرر کیا ہے کہ اسرارِ پنہاں کی سینہ شگافی کر کے ان پر قدرت حاصل کر لی جائے ۔ قران میں سائینس ہے گویا سائینس قرآن کا جز اکبر ہے ۔ تمام عناصر قوتوں کے خزانوں سے معمور ہیں ۔ مسلمان کا علمی فریضہ ہے کہ علمِ زمین کے ساتھ عِلمِ عرش کی دولت سے بھی مالا مال ہو ۔

رہِ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

ہمارا مسلمان بجائے حصولِ علم کی سعی کے تحقیقِ علم پر نکتہ چین ہے بلکہ اس تحقیق کو کفر کہتا ہے جو عین ایمان تھا ۔ اور اس سائینس داں طبقہ کو کافر کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ اور اپنی جہالت پر توجہ نہیں فرماتا ۔ ؎

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دِلِ صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

مسلمان اسقدر تن آساں ہو چکا ہے کہ سعی و کاوش سے گھبراتا ہے ۔ ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

مسلمان کو ربطِ ملت کی تعلیم دی گئی ہے جو رازِ زندگی ہے۔ وہ انسان جو ہر رہرو کے ساتھ ہے لیکن کسی کو مستقل ہمسفر نہ بنا سکے کبھی نشانِ منزل حاصل نہیں کرسکتا۔ اور وہ انسان جو پانی کی طرح اپنا مقام چھوڑ کر ہر نشیب کی طرف بہہ جائے مقامِ بشریت بھی حاصل نہیں کرسکتا ہے۔

نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کرلے

بلکہ اسکا جوہرِ حیات بضد ہے کہ قطرہ کی طرح دریا میں ملکر اجتماعی زندگی سے ہم آہنگ ہو جائے۔ قطرے کی دریا سے یہی ہم آغوشی اسے دریا بنا دیتی ہے ورنہ قطرہ ہر حال میں قطرہ ہے جسکی کوئی قدرو قیمت نہیں ہے اور پھر جب یہ قطرہ آغوشِ صدف میں چلا جاتا ہے تو گوہرِ آبدار کی صورت حاصل کرتا ہے دنیا اسے گوہرِ گراں مایہ جاننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اِسی میں دیکھ مضمر ہے کمالِ زندگی تیرا
جو تجھکو زینتِ دامن کوئی آئینہ رو کرے



شہنشاہ سکندر کے پاس دولت سے معمور خزانے تھے لیکن وہ دنیا کی نگاہ میں عزیز نہ ہو سکا۔ اور یونان سے اُس کے دورِ سلطنت کے بعد اس کے نام کو بھی فراموش کر دیا۔ دارائے

تختِ داریوش اور تاجِ کیانی کو موتیوں سے جڑ دیا مگر اسکی وفاتِ حسرت ناک کے بعد ایران نے اسکی معاشرت کو پسِ پشت ڈالدیا۔ چنگیز خاں نے دولت کے بل بوتے پر۔ عوام کو ہمنوا بنانا چاہا لیکن اسکا نشد بھی ناکام رہا۔ ہلاکو خاں نے جواہرات کے لالچ سے عقیدت کا سودا کرنا چاہا مگر اسکا استبداد خود ہلاک ہوگیا۔

قارون نے صرف دولت کے نشے میں مست ہو کر خداوندی کا اعلان کیا لیکن وہ دولت موت کو لالچ نہ دے سکی۔ اسلام نے آکر قوموں کو سکھایا کہ عقیدت۔ محبت۔ الفت اور اخوت دولت سے نہیں بلکہ اخلاقِ فہمیدہ سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ۔۔ ؎

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری



تاریخِ آدم شاہد ہے کہ آجتک کوئی اسیر مستقل طور پر اسیری میں نہیں رہا۔ بلکہ تاریخ نے دنیا کا دوسرا نام انقلاب رکھلیا ہے۔ قوموں میں یہ انقلاب کیوں آتے ہیں؟ محکوم قوم جب کسی حکومت کی اسیری قبول کرتی ہے تو اسکے لب پر تبسم نہیں ہوتا بلکہ اسکی مسرتوں کا دم گھٹ جاتا ہے۔ اسیر ہونے سے پہلے اسیری کے وجوہات پر اسکی نظر نہیں ہوتی یہی بے آگہی اسکی غلامی کی زنجیر بجاتی ہے لیکن

غلامی میں آزادی اور زندگی کے احساس کو حرارت دیکر گرماتی ہے۔ جسقدر وہ اسیری میں بندش محسوس کرتی ہے اُسی قدر جوہرِ حیات میں آبداری آجاتی ہے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بنجاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

جس قدر فطرتِ انسانی محتاجی۔ اسیری اور غلامی بیتاب و بیقرار ہوگی اُسی قدر اپنی آزاد راہوں کی کشادگی کے لئے ہمہ تن مصروف رہیگی اور جب وہ اپنی کوششوں سے زندگی حاصل کریگی تو اُسے ایک گونہ لطف و مسرت محسوس ہوگی۔

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

دوسرے انسان کو سہارا دیکر فکرِ زندگی سے بے نیاز کر دینا سب سے بڑی دشمنی ہے۔ بظاہر انسان سہارا دینے والے کو بہت بڑا کریم سمجھتا ہے اور تا دمِ آخر اسکے احسانات کے گن گاتا رہتا ہے۔ لیکن وہ نہیں سمجھتا کہ محسن کا یہ احسان یا سہارا اسکی فطری قوتوں کو تھپکیاں دیکر سلا رہا ہے۔ اسکی بیباک چنگاریوں پر اوس گرا رہا ہے۔ اُسکے مچلتے ہوئے ولولوں کو افیوں پلا رہا ہے۔ اور اس کا یہ

محسن اسکا سب سے بڑا دشمن ہے ۔ اسکے مقابلہ میں جو کسی کو سہارا نہیں دیتا دیکھا جائے تو دائیرہ انسانیت میں سب سے بڑا محسن ہے جو اسکی بیدار قوتوں کو نکما نہیں بناتا ۔ اسکی نشو و نما کی راہ میں پتھر نہیں بنتا ۔ اُس کے ذہنی ارتقا میں رکاوٹیں پیدا نہیں کرتا بلکہ اسے ایک فاقہ دیگر اسکی غیرت پر ضربِ کاری لگاتا ہے ۔ ذلت کی پستیوں سے اٹھا کر انسانیت کی راہوں پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے ۔ وہ اس صحرا میں پہنچکر وسعتِ حیات کو محسوس کرتا ہے اور زندگی کی ہزاروں راہیں اُس کا استقبال کرتی ہیں ۔ ؎

کیوں تعجب ہے میری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگا پوئے دما دم زندگی کی ہے دلیل
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بیخبر رازِ دوامِ زندگی

حصولِ نصب العین تک بڑی کٹھن منزلیں آتی ہیں لیکن ثابت قدمی اور استقلال اُسے حاصل کر کے ہی رہتے ہیں ۔ ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے　　گرچہ اِک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب　　اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو



"بندے کا خدا ہو جانا"۔ یہ وہ فقرہ تھا جس پر کفر کے فتوے عائد ہوتے رہے اور دار و رسن کے بارہا قصے ہمیشہ تازہ ہوتے رہے۔ ہمارے مولوی نے یا تو قرآن کریم کو سمجھا نہ تھا اور اگر سمجھا تھا تو عوام کو اسلئے نہ سمجھایا کہ مبادا عوام اسکے ہاتھ سے نکل جائیں۔ اللہ کی تفسیر اللہ کا قانون ہے یعنی قانونِ خداوندی کا ہی دوسرا نام خدا ہے چنانچہ جو سوسائٹی ان قوانینِ خداوندی کی علمبردار ہو گی وہ ایک طرح کی خدا بنجائیگی جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ یہی وہ تڑپ تھی جس سے اس خاک میں جان آتی ہے۔ ؎

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ　　پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار　　اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار　　تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب　　تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر　　رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

جنکی نگاہ بلند ہوتی ہے وہ آسمان کے سائے میں اپنی پناہیں نہیں ڈھونڈتے ۔ مسلمانوں کی عظمت وسطوت رفتہ کے قصے ایک افسانہ بنکر رہ گئے ہیں ۔ دنیا تو دنیا خود مسلمان انگشت بدنداں ہے کہ ان کے بزرگ گنتی کے آدمی تھے لیکن جس طرف اٹھتے طوفان بنکر اٹھتے اور آندھی بنکر چھا جاتے ۔ انکی شجاعت کی داستانیں الف لیلیٰ کی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں ۔ اور باور نہیں ہوتا کہ ۳۱۳ انسان ہزاروں کے مقابلہ میں نکل کر کامران و کامیاب کیونکر ہوئے ؟ کاش مسلمان کو اس فتحمندی کے راز معلوم ہو جائیں ۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ وہ زمین کی حدود متعین نہیں کرتے تھے اور نہ ہی غیر اللہ قوتوں کے آگے سر جھکانا جانتے تھے ۔ ان کے نزدیک راستے کی قناعتیں گناہ تھیں لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ ایک وقت کی گذر پر قناعت کرکے دوسرے وقت کو خدا پر سونپ دیتے ہیں ۔

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک ؟



ہر نشے کا فطری خاصہ ہے کہ اپنے اندر خارجی تفکرات کو جذب نہیں کرتا ۔ چنانچہ خرد کے تقاضوں نے نشہ کو احسن قرار نہیں دیا ۔ نشہ

براہِ راست دماغی توازن پر غالب آتا ہے اور جب دماغی توازن متزلزل ہوتا ہے تو حواس ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہو جاتے ہیں۔ حکومت کا نشہ تمام مادی نشوں سے پر اثر ہے اسی لئے اللہ تعالےٰ نے حکومت کو سلطنت میں تبدیل نہیں کیا اور نہ ہی امیر الوقت کو سلطان یا شہنشاہ کے لقب سے سرفراز کیا ہے۔ بلکہ ان دونوں چیزوں سے متنفر ہے۔ حکومت جب تک صرف اللہ کے لیے متصور رہتی ہے اور قوانینِ حکومت صرف ضابطۂ حیات (قانونِ الٰہی) تک محدود رہتے ہیں تو نظامِ حکومت میں کسی قسم کی شیطانیت مداخلت نہیں کرتی۔ لیکن جونہی یہ نظام غیر فطری دستور کے ماتحت جاتا ہے وراثتِ ارضی کی تمام صلاحیتیں مفقود ہوتی جاتی ہیں حتےٰ کہ یہ جام ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ عین اس وقت اسکی آوازِ شکست سے شور بیدار ہوتا ہے۔ ؎

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
حق ترا چشمے عطا کردست غافل درنگر

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر



اسلام نے حکومت کی صلاحیت کے جائزے رکھے ہیں۔ خدا

دنیۂ عالم نے اس حکومت کو جو اللہ کا سب سے بڑا انعام ہے کسی ایک خاندان یا ایک گروہ کے لئے مخصوص نہیں کیا۔ اسلام نے باہمی مشورت کو احسن کہا ہے۔ اور تاکید کی ہے کہ نظام حکومت کے معاملات کو مجلس مشورت میں طے کر لیا کرو۔ اور یہ اسی وقت صورت پذیر ہو سکتی ہے جب نظامِ مملکت ایک کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ مجلسِ مشورت کے مشترکہ ہاتھوں میں ہو۔ یہ مشترکہ جماعت از خود ملک کی نمایندہ جماعت ہوتی ہے اور اس کا ہر ممبر اپنے قبیلے کا نمائندہ ہوتا ہے اسی طرز معاشرت کا دوسرا نام جمہوریت ہے۔ جمہوریت کے علاوہ کی شہنشاہیت کو اسلام نے پسند نہیں فرمایا اور نہ ہی جائز قرار دیا ہے۔ یہ طرز معاشرت جسکی فلاح و بہبود میں عوام کا زیادہ سے دخل نہیں ہوتا ایک خاندان کے لئے مخصوص ہو کر رہ جاتی ہے۔ عوام انکے تراشیدہ دستورِ حیات کے آگے سر جھکا دینے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں یہیں سے غیر اللہ کی پرستش کی بنیاد پڑتی ہے اور یہی وہ سلاطین ہیں جو نظام الٰہیہ کی راہ میں بتکدے تعمیر کرتے ہیں اور یہی امتیازِ نسلی قوم کی روح کو کھا جاتا ہے۔ ؎

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

مسلمان کی بدبختی کی انتہا دیکھئے کہ اپنے زوال کے اسباب کی نوعیت

بھی نہیں آ سکتا۔ جب تک کوئی شخص اپنی ناکامی کی وجوہات کا صحیح طور پر جائزہ لیکر ایک نتیجہ پر نہیں پہنچتا وہ اپنی راہوں کا رخ نہیں بدل سکتا یہی حال ملتِ اسلامیہ کا ہے اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ خاکی انسان اپنے خدا کی زبان کیونکر تھا۔ وہ اسے اپنی معراج کی راہیں بھی یاد نہیں ہیں یہ ستارے جسکی گردِ راہ تھے۔ حالانکہ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جسکی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تیرے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہدے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہدے

آج یہ امینِ اعظم اپنی پونجی کو لٹیروں کے خوف سے دوسروں کی پناہ کا سہارا دے رہا ہے۔ آج یہ معمارِ جہاں اپنے حریمِ دل کی تعمیر مرمت کے لئے مغربی معماروں کی دریوزہ گری کر رہا ہے۔ اور قرآن اسے پھر اپنی طرف بلا رہا ہے اور بآوازِ بلند کہہ رہا ہے کہ۔

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تیری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے
تیری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گِل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اتحاد ۔ تنظیم اور ہم آہنگی وہ جوہر ہیں کہ جن سے قوموں کے رعب و داب میں بجلیوں سی چمک بادلوں سی گرج اور طوفانوں سا زور سرکشی پیدا ہوتا ہے ۔

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ فقرِ بوذرؓ صدقِ سلمانیؓ
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں

کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا



تقسیم ہند یعنی وجودِ پاکستان سے پہلے ہندوستان میں اوّل اوّل صرف ایک ہی جماعت برسرِ عروج تھی اس کانگریس جماعت کی روح انقلابی دور کے لئے مضطرب و بیتاب رہا کرتی تھی ہزاروں جلوس۔ لاانتہا جلسے منعقد ہوتے رہے ۱۸۵۷ء سے انگریزی دورِ حکومت کی مخالفت شروع ہوئی۔ حکومت نے اپنی استبدادی قوتوں سے اسکے غیر مستحکم نصب العین کو پیس پیس کر رکھدیا۔ لیکن اسکے برعکس مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت پلیٹ فارم پر آئی اور بغیر کسی شورش و ہنگامے کے اپنی منزل معینہ کی جانب دیوانہ وار بڑھتی چلی گئی۔ اسکا عزم راسخ اسکے ذوق میں یقین۔ اس کے یقین میں استحکام اور اسکے ارادوں میں غیر متزلزل قوتیں کارفرما رہی ہیں۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی منزل تک پہنچ گئی دنیا انگشت بدنداں رہ گئی لیکن کسی نے کہا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ولایت ۔ بادشاہی ۔ علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ساری دنیا محوِ حیرت ہے کہ مسلم لیگ کے پاس کیا جادو تھا جو پچاس برس کی تحریکِ آزادی (کانگریس) کو کچل کر آگے نکل گئی اور قائد اعظمؒ کے پاس کیا معجزہ تھا کہ بغیر جیلیں بھرے قوم کو کنارے پر لے آئے۔

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو۔ بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

مسلمان شکست سے متاثر تو ہوتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے جب تک وہ اس شکست کو فتح مندی میں تبدیل نہیں کر لیتے چین کی نیند نہیں سوتے۔ وہ کشمکشِ حیات سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

ہم اپنی تاریخِ پارینہ اور داستانِ عظمتِ دیرینہ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو تحریرِ عروج و زوال کے الفاظ زبانِ واقعات سے اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

یقیں افراد کا سرمایہ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے



قرآن کریم نے مومن کو خدا کی ترجمانی کی تعلیم دی ہے۔ اخوت کے راز اس انداز سے نمایاں کر دیئے ہیں کہ وہ اپنی دلیل کا دعوہ بن گئے ہیں۔

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بنکے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی



ملت اسلامیہ اپنے دستورِ حیات کو ترک کر کے دنیا کے

سامنے کچھ اس انداز سے نادم ہے کہ کھلے بندوں اسلام کا نام لینا بھی گوارا نہیں ہے اور اپنے تئیں مسلمان کہتے ہوئے جھجکتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ دیگر اقوامِ عالم اسکا مذاق اڑائیں یہ خود ندامت سے سربگریباں ہو جاتی ہے یہ اس قوم کا حال ہے جو اقوامِ عالم کو سربلندی و سرفرازی کے طریق سکھانے کے لئے آئی تھی۔ آج اسکی ذود پشیمانی پر اہلِ عرش طنزاً یہ کہتے ہیں۔

تو جو بجلی ہے تو یہ چشمکِ پنہاں کب تک
بے حجابانہ میرے دل سے شناسائی کر
ہو تیری خاک کے ہر ذرہ سے تعمیرِ حرم
دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر
اس گلستاں میں نہیں حد سے گذرنا اچھا
ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر



پیامِ اقبالؒ

اس نظامِ کائنات میں انسان کی صحیح پوزیشن کیا ہے! اسے سب سے پہلے قرآن کریم نے ہی متعین کیا ہے، اسی کا نام حضرت علامہ کے الفاظ میں خودی ہے یہ اعلان آپ کو قرآن ہی میں ملیگا کہ

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيعًا ۝

جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے۔ جو کچھ ان پستیوں اور بلندیوں میں ہے سب کچھ تمہارے تابع فرمان کر رکھا ہے۔

یہ تو اس کائنات سے متعلق ہے۔ لیکن قرآن کریم تو اس سے بھی آگے جاتا ہے (اسکا ذکر آگے چلکر آئے گا) حضرت علامہ انسان کی گزری ہوئی کہانیوں کی تحقیق میں زیادہ کاوش پسند نہیں فرماتے کہ وہ ایک نظری سی شئے ہے۔ ہماری "آج" کی دنیا پر اسکا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے؟

قرآن کریم کوئی علم الحیات ( ) کی چیز نہیں کہ اس میں ان امور کی ریسرچ درج کر رکھی ہو بایں ہمہ جہاں کہیں بھی تخلیقِ انسانی کا ذکر اس میں آگیا ہے جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ وہی ہے۔ جس پر انسان اپنے کمال تحقیق کے بعد پہنچے گا۔ یہی حالت دیگر علوم سائنس کے متعلق ہے قرآن میں تبعًا اور ضمنًا جہاں جہاں انکا ذکر آگیا ہے وہ ایک حقیقت ثابتہ ہے ہو نہیں سکتا کہ انسانی انکشافات جس نتیجہ پر پہنچیں۔ قرآن اسکے خلاف ہو بشرطیکہ وہ انکشاف حقیقت کی حد تک پہنچ چکا ہو۔ محض قیاس آرائی ہی نہ ہو۔ انسانی انکشاف ہے کیا! یہی ناکہ فطرت کی ایک حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل تھی۔ انسانی کدوکاوش نے وہ پردہ اٹھا دیا۔ وہ حقیقت جیسی تھی سامنے آگئی اسی کو انکشاف کہتے ہیں۔ ایتھر اس فضا میں موجود تھا۔ بجلی کی لہریں یہیں تڑپ رہی تھیں

اتنا ہی تھا کہ پہلے نگاہ سے اوجھل تھیں۔ اب بے نقاب ہو کر سامنے آگئیں لیکن خدا وہ ہے جس نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اگرچہ چھپی ہوئی ہیں تو انسانوں کی نگاہوں سے چھپی ہوتی ہیں۔ خدا کی نگاہوں سے تو چھپی ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس لئے جہاں کہیں خدا انکا ذکر کرے گا۔ وہ تو ایسے ہی کرے گا جیسے کوئی اس چیز کی بابت کچھ کہے جو اسکی آنکھوں کے سامنے بے نقاب موجود ہو۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسانی انکشافات کے نتائج اور قرآن کریم کا بیان باہم متضاد ہوں۔ جہاں کہیں تضاد ہو۔ سمجھ لیجئے کہ انسانی تحقیق میں ابھی غلطی ہے جسے وہ حقیقت سمجھ رہا ہے۔ قیاس آرائی ہے کہ جب حقیقت۔ حقیقت ہو کر سامنے آجائے گی تو وہ وہی گی جو اس حقیقت کے پیدا کرنے والے نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے، اس نظریۂ ارتقاء کو لیجئے جو دورِ حاضرہ کے انکشافات میں ایک معرکۃ الآرا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، اس نظریہ میں جو چیزیں بطورِ حقیقت کے معلوم ہو چکی ہیں وہ وہی ہیں جنکا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے اور جنکی روشنی میں اسلامی مفکرین۔ مثل فارابی۔ اور ابن مسکویہ نے ویلیس اور ڈاروِن سے کہیں پہلے ان نظریوں کی داغ بیل ڈال دی تھی[۱]۔ (نظریۂ ارتقاء اور قرآن کریم ایک جداگانہ مبحث ہے۔

[۱] اسی طرح مثلاً فلکیات کو لیجئے جو کچھ گیلیو اور کوپرنیکس نے اپنی آنکھوں سے (بذریعہ دُور بین) دیکھ کر کہا اور جس پر آج کے نظریۂ فلکیات کا مدار ہے قرآن کریم نے چودہ سو برس پیشتر وہی کچھ کہہ دیا تھا یا اس تخلیقِ ارض و سما کے متعلق جو کچھ سائنس کے (باقی صفحہ پر دیکھئے)

جسے کہیں اور بیان کیا جائے گا) لیکن یورپ کے حکما اس نظریہ کے ماتحت انسان کی سابقہ کڑیوں کی تحقیقات کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں اور انسان کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتے ہیں۔ کہ اس کی موت کے ساتھ یہ سلسلۂ ارتقاء بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس حصہ زندگی کو محض ابتداء قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے منزل تو ابھی شروع ہوئی ہے انسان کی موت اس سلسلۂ ارتقاء کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اگلی کڑی کی ابتدا ہے۔ آپ دیکھئے کہ سلسلۂ ارتقاء میں جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات تک آتے آتے ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ اگلی منزل میں بمقابلہ پچھلی منزل کے ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو مجرد مادہ میں موجود نہ تھی۔ مادہ غیر شعوری شے ہے اس میں تعقل و ادراک نہیں۔ لیکن مٹی سے درخت اور درخت سے حیوان کی تدریجی ترقی میں یہ کیفیت نظر آئے گی کہ وہ چیز جو مادہ میں مفقود تھی۔ ان کی اگلی کڑیوں میں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ حیوانات میں ایک خفیف سی حد تک عقل و شعور آجاتا ہے اور اس سے اگلی منزل۔ یعنی انسان میں یہ خصوصیت ابھر کر سطح پر آجاتی ہے۔ شعور و ادراک، جذبات۔ و احساسات پیدا ہو جاتے ہیں، یہ وہ چیز ہے جو مادہ میں موجود نہ تھی۔ گویا سلسلہ ارتقاء کی ہر کڑی میں "مادیت" سے کسی "غیر مادیت" کی طرف قدم اٹھتا ہے " خاکی " سے کچھ " نوری "

بقیہ حدیث ۲۰۳ :۔ انکشافات ثابت کر رہے ہیں۔ ایک ایک چیز قرآن کریم میں موجود ہے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ قرآن کو تو مسلمان کھول کر دیکھتے ہی نہیں۔

سا ہو جاتا ہے۔ ہر چند یہ "غیر مادی" عنصر (اسے ایسا ہی کہنا چاہیئے کیونکہ اور کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتا) انسان میں آ کر نمایاں ہو گیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ عنصر ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے، لہذا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جائے اسکا آگے بڑھنا ضروری ہے اور یہی آگے بڑھنے کی منزلیں ہیں جہاں جا کر یورپ کے حکماء اور ایک مسلم حکیم میں فرق شروع ہوتا ہے حکیم مومن کے نزدیک حیات ایک مسلسل شے ہے اور موت اسکا خاتمہ نہیں کر دیتی، بلکہ شبِ تیرہ و تار کے بعد ایک نیا دن طلوع کرتی ہے، مادی عنصر میں تو تاریکی ہی تاریکی ہے یہ عقل و خرد۔ یہ شعور و ادراک کی چمک تو مادہ سے آگے بڑھنے میں ہی پیدا ہوتی ہے لہذا یہ سلسلۂ ارتقا جتنا آگے بڑھتا جائے گا۔ تیرگی درخشندگی میں تبدیل ہوتی جائے گی۔ وہ لوگ جنکے اس منزل میں اعمال صالح ہونگے۔ یعنی ایسے کام جو اس میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں کہ وہ اس سے اگلی زندگی اس سے نفیس و لطیف۔ اس سے اعلیٰ وارفع زندگی بسر کر سکے۔ وہ اوپر کی منزل میں چلے جائینگے جسے جنت کہتے ہیں۔ جنکے اعمال انہیں اصلح (انہیں بنائینگے) وہ سلسلۂ ارتقا کی اگلی منزل میں نہیں پہنچ سکیں گے، وہیں روک دیئے جائیں گے یہ جہنم کی زندگی ہوگی۔ لہذا موجودہ زندگی تو انسانی خمیر کے آب و گل کی زندگی ہے۔ ذرا اسے سنور لینے دیجئے پھر دیکھیئے یہ کیا بنتا ہے۔ "انسان کا مستقبل" یہ ہے وہ موضوع

جو حضرت علامہ کے تمام کلام کا گویا نقطۂ اساسی ہے فرماتے ہیں:۔

یکے در معنیِ آدم نگر از من چہ می پرسی ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

اس نظامِ کائنات میں انسان کا درجہ کس قدر بلند ہے اسکے لیے اس داستان حقیقت کشا کو دیکھیے جو تخلیقِ آدم کے باب میں پہلے ہی پارہ میں تمثیلاً بیان کی گئی ہے، اور جس میں فطرت انسانی سے خطاب ہے۔ حضرت آدم گویا تمام نوعِ انسانی کے نمایندہ ہیں۔ فرشتوں سے کہا جاتا ہے کہ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃ۔ میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں جب اس ہیولیٰ آب و گل کو غور سے دیکھتی ہیں تو اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ عرض کرتے ہیں کہ بار الٰہ! یہ فتنہ سامانیوں کا مجموعہ اور خلیفہ فی الارض!! اس اعزاز کے مستحق تو کچھ ہم ہی نظر آتے ہیں۔ کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں اور اپنے اختیار دارادہ سے کام لیے بغیر وہی کچھ کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔ خلاقِ فطرت کے چہرے پر ایک حسین تبسم نے گل فشانی کی اور فرمایا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں جانتا ہوں۔ کہ یہ مضمون موزوں ہو کر کیا بننے والا ہے، اور تم کیا ہو۔ لیکن اتنا کہہ کر فرشتوں کو ساکت ہی نہیں کر دیا گیا۔ بلکہ اسکے ثبوت میں عظمتِ آدم کی ایک جھلک بھی دکھا دی، اسے علم الاشیاء، علم الفطرت عطا کیا گیا اور فرشتوں

سے پوچھا کہ تم بھی اس کی نسبت کچھ جانتے ہو؟ انہوں نے گردنیں جھکا دیں اور عرض کیا کہ حضور! لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔ ہمیں تو اتنا ہی پتہ ہے جتنا ہمیں سکھایا گیا ہے فرمایا کہ اب بتاؤ کہ یہ ہمارے رازوں کا امین، یہ عظمتوں کا پتلا اس قابل ہے یا نہیں کہ تم اس کے سامنے جھک جاؤ۔ اب سوائے اعترافِ حقیقت کے چارہ کیا تھا، وہ جھکے اور بار بار جھکے۔

حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ

کجا نورے کہ غیر از قاصدے چیزے نمی داند
کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را

بال جبریل میں فرماتے ہیں ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

ذرا غور کیجئے اس فلسفہ پر، نظامِ فطرت کی ہر شے اس غرض سے پیدا کی گئی ہے کہ انسان اس سے کچھ کام لے یا وہ انسان کی کچھ خدمت بجا لائے۔ ان اشیاء کا وجود انسان کی زندگی اور زندگی کی ضروریات کے لئے ہے ہوا نہ رہے، تو انسان بھی نہ رہے، پانی نہ رہے تو انسان نہ رہے لیکن اگر روئے زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہے تو بھی سلسلۂ کائنات اسی طرح جاری رہے۔ اس میں کوئی نقص واقع نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کا وجود اس نظامِ کائنات کے لئے نہیں اس کی تخلیق سے یہ غرض نہیں کہ اسی دنیا کا ہو کر رہ جائے۔ دنیا اس

کی خاطر ہے نہ دنیا کی خاطر نہیں - یہ اس سے کسی بلند و بالاتر مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور یہی چیز اسے نظام کائنات سے ممتاز کرتی ہے - لیکن یہ شرف اختیار - یہ امتیاز و خصوصیت محض ایک انسان کے گھر میں پیدا ہو جانے سے ہی نہیں حاصل ہو جاتی اس کے لئے ایک "یقین کامل" اور "عمل پیہم کی ضرورت ہے - جب کسی قوم میں یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ " خیر اُمت" بنجاتی ہے اس کو حزب اللہ - اللہ والوں کی جماعت کہتے ہیں - اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں - کہ اس جماعت - اس حزب اللہ کا مقام کس درجہ بلند ہوگا اس جماعت کے بھولے ہوئے فرد سے خطاب کر کے فرماتے ہیں :-

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

قرآن اور خودی

اقبال اور قرآن

دعائے خلیل

"اور (دیکھو وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا) جب ابراہیم خانۂ کعبہ کی بنیادیں چن رہا تھا۔ اور اسماعیل بھی اس کے ساتھ شریک تھا۔ ان کے ہاتھ تو پتھر چننے میں مصروف تھے اور دل اور زبان پر یہ دعا جاری تھی کہ

اے پروردگار۔ ہم تیرے دو عاجز بندے تیرے مقدس نام پر اس گھر کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ تاکہ یہ دنیا میں تیری توحید کا مظہر اور وحدتِ انسانیت کا مرکز بن سکے۔ تو ہمارے اس عمل کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور دلوں کے ارادوں کا جاننے والا ہے۔ اے پروردگار ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم سچے مسلم (یعنی تیرے قوانین کے اطاعت گذار) ہو جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کر دے جو تیرے ضابطۂ قوانین کی محکم و مطیع ہو۔ اور اس کے سوا کسی اور کے حکموں کے سامنے سر نہ جھکائے۔ خدایا ہمیں اس محکومیت کی اطاعت کے صحیح انداز و طریق (نظامِ دین) بتلا دے۔ اور اس باب میں ہم سے اگر کوئی سہو یا فروگذاشت ہو جائے تو اسے (وفورِ حسنات کی قوتوں سے) درگذر فرما دے کہ

بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگذر کرنے والی ہے"

"اور خدایا ایسا کیجیو کہ اِس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو انہی میں سے ہو۔ وہ تیرے احکام سے لوگوں کو آگاہ کرے۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔ ان کے جوہرِ انسانیت کو بالیدگی عطا کرے۔ یقیناً تو غالب حکمت والا ہے۔ [2] ۱۲۷-۱۲۹

حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا اپنی آنے والی نسلوں کے لئے مانگی۔ اِس دعا میں دنیاوی حکومت۔ رزق اور جاہ وجلال کی کہیں آرزو نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن ہی کے فیصلے ہیں کہ بغیر قوت کے کوئی قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ آپ حیران ہوں گے کہ پھر اُس قوت وغلبہ کی تمنا کیوں نہیں کی گئی؟ جواب نہایت آسان ہے دعا معراجِ انسانیت اور شرفِ انسانیت کی مانگی گئی ہے۔ معراجِ انسانیت ایک دائرہ ہے جس کے اندر دین و دنیا کی تمام عظمتیں محدود ہیں۔ اور یہ تمام عظمتیں ایک حفاظتِ خودی سے میسر آتی ہیں۔ خودی نام ہے اپنی اور اپنے اُس جوہر کی حفاظت کا جو صرف انسان کو عطا ہوا ہے۔ اور اُس جوہر کا عمل ہے نصب العین کے حصول کی خاطر سعیِ پیہم، مسلسل اور مستقل۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے اسی معراج کی علت اور علت کی تشریح فرمائی ہے۔ ارمغانِ حجاز میں ارشاد ہے کہ:۔

خودی ہے زندہ تو ہے موت اِک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا !!!
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم !!
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات
نگاہ ایک تجلی سے ہے اگر محروم !!
دو صد ہزار تجلّی تلافیِ مافات !!
مقام بندۂ مومن کا ہے وراۓ سپہر
زمیں سے تا بہ ثریّا تمام لات و منات
حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی
نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

آرزوۓ کلیم

"اور جب موسےٰ نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ خدایا اِس زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی لکھدے اور آخرت کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی کر۔ ہم تری طرف لوٹ آۓ"

"اللہ نے فرمایا۔ میرے عذاب کا تو یہ حال ہے کہ وہ میرے قانونِ مشیت کے مطابق ہی آتا ہے (یونہی نہیں آجاتا) باقی رہی

رحمت۔ سو وہ ہر شے پر چھائی ہوئی ہے۔ اس میں اس رحمت کو ان لوگوں کے لئے مقدر کردوں گا جو برائیوں سے بچیں گے اور ذکوٰۃ ادا کریں گے اور جو میرے توانین پر ایمان لائیں گے ــــــ جو رسول کی پیروی کریں گے کہ نبی امیؐ ہو گا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے۔ وہ انہیں معروف کا حکم دے گا۔ منکر سے روکے گا۔ طیبات حلال کرے گا خبائث حرام قرار دے گا۔ اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے نیچے وہ دبے ہوئے ہوں گے۔ اور ان پھندوں سے وہ نکالے گا جن میں وہ گرفتار ہوں گے۔ سو جو لوگ اس پر ایمان لائیں گے اور تمام مخالفانہ قوتوں کی روک تھام کریں گے اور (تمکین دین کے لیے) اس کی مدد کریں گے اور اس روشنی کی پیروی کریں گے جو اس کے ساتھ بھیجی جائیں گی۔ سو وہی لوگ کامیابی پانے والے ہوں گے۔" ۷ / ۱۵۶ - ۱۵۷

حضرت موسےٰ کو جو خدا کی جانب سے جواب ملا وہ صاف اور کھلا ہوا بیان ہے کہ رسولؐ ایک روشنی لے کر تشریف فرما ہوں گے چنانچہ جو لوگ اس روشنی کو دیکھنے کی آنکھ رکھیں گے وہ اس پر ایمان لائیں گے یعنی نورِ رسول اللہؐ کو تسلیم کریں گے سو نجات انہی کے لئے ہے لیکن جو تعصب یا کسی اور وجہ

ہے عقل و بصیرت کی تنگ دامانی پر اکتفا کریں گے وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ حالانکہ تجلی کی فراوانی موجود ہو گی۔

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارہ ہے اسے نظارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

اپنی کہانی

تاریخ کی یادداشتیں اس پر شاہد ہیں کہ چودہ سو سال پیشتر دنیا کا یہ نقشہ تھا کہ شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جو ہر انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا نشان تک باقی نہ تھا۔ اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں اجڑ چکی تھیں۔ اس وسیع زمین پر انسان کو زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ زمین پر بسنے والے مایوس ہو کر آسمان کی جانب تک رہے تھے۔ چنانچہ فطرت کا تقاضا تھا کہ ان کی پکار سنی جاتی۔ اور خزاں کو پھر شگفتگی میں بدل دیا جاتا۔ ربِ دو جہاں نے انسانوں کی اس بستی میں حضرت محمدؐ کو پیدا کیا۔ انسانیت کی مرجھائی ہوئی

کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ ہم وہی تھے جن کے ابرِ کرم نے خزاں کے دامن کو پھولوں سے بھر دیا اور آج بھی وہی ہم ہیں کہ اپنی نگاہ سے اپنا راستہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔

کہن ہنگامہ ہائے آرزو سرد
کہ ہے مردِ مسلماں کا لہو سرد
بتوں کو میری لادینی مبارک
کہ ہے آج آتشِ اللہ ھو سرد

شکستِ بتکدہ

مردِ مومن شمشیر بکف ہوا۔ توحید کا دور آیا۔ دنیا کے صنم کدوں کے بُت پاش پاش ہو گئے۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا۔ جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت روپوش ہونے لگی۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہونے لگیں کہ اُس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اِسے جگمگاتا چراغ کہہ کر پکارا۔ دورِ انسانیت نے اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ احبار و رہبان کی برہمنیت کے اطواق و سلاسل قیصر و کسریٰ کی زنجیریں۔ توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں ختم ہوئیں۔ انسان ایک بار پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے لگا۔ عقل کو عشق کا جنوں ملا۔ فقر کو شکوہِ خسروی عطا ہوا۔ بادشاہی کو

استغنائے قلندری عنایت ہوا۔ مسلمان خود تقدیرِ یزداں بن گیا۔ اور اس مردِ مومن نے دوسروں کو یہ کہہ کر جھنجھوڑا کہ۔

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں!!
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

حریمِ شباب

ظہورِ رسالت مآب کا وقت آیا۔ صحیفۂ فطرت حریمِ شباب میں آگئی وادیٔ بطحا کے صحنِ گلستاں پر بہار آگئی۔ ہر وقت مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے۔ چاند مسکرایا ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فلک تعظیم کے لئے جھک گیا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدوں سے اٹھائی کہ آج اُس کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آگیا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اٹھے۔ مکہ کی گلیوں کا نصیب جاگ اٹھا۔ ظہورِ رسالت سے اسلام کا ظہور ہوا۔ توحید کا اعلان ہوا۔ انسان نے انسانیت کا چہرہ دیکھا۔ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمہ تبریک گایا۔ حضرت آمنہ رضؓ کے گھر کو مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرے چمک اٹھے۔ جب رہبرِ اعظم نے زمانے کو یہ سبق

دیا کہ :۔

خرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لا الٰہ سے!

فقط اک گردشِ شام و سحر ہے!
اگر دیکھیں فروغِ مہر و ماہ سے

رحمتہ للعالمین

یہ آنے والا رحمتہ للعالمین بن کر آیا۔ اور اپنے ساتھ ایسا نظامِ عدل لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ اسی محمدؐ کی وساطت سے کتابِ مبین کی تعلیم عام ہوئی۔ یہ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی۔ جو قلبِ محمدیؐ میں اتاری گئی۔ یہ گلدستہ جو محرابِ کعبہ میں رکھا گیا اس کے پھولوں میں بھی وہی بوئے وحدت تھی۔ جس کے سوا دوسرے کی اطاعت حرام ہے۔ آپ سے پہلے جس قدر بھی انبیاء کرام آئے انہوں نے اسی ایک اللہ کی تعلیم عام کر دی اور محمدؐ کا پیکرِ جلال و جمال بھی انہی بکھرے ہوئے موتیوں کا حسین مجموعہ ہے۔ وہ ہستیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ابتدا تھی یہ انتہا تھا۔ اس انتہا نے پھر وہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور انسان کو اس کے جوہر

سے روشناس کراتے ہوئے فرمایا کہ ۔

کبھی دریا سے مثلِ موج ابھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

اسرارِ آدمیت

غارِ حرا کی تنہائیوں میں حضورؐ کی معتکفانہ زندگی ایک انفرادی تجربہ گاہ کی زندگی تھی۔ لیکن جب حقیقت نے آپ پر کماحقہٗ اپنا انکشاف کیا تو اس سے مقصود یہ نہیں تھا کہ آپ اس کیف دستی کے عالم میں جذب ہو کر خلوت گزینی کی زندگی اور فرادیہ نشینی کا طریق اختیار کر لیتے۔ رموزِ کائنات اور اسرارِ آدمیت کے پردے اٹھ جانے سے آپ کو خود آگہی و خود شناسی کی متاعِ بے بہا مل گئی۔ سب سے پہلے اُس غیر فطری زندگی پر نظر گئی جو صدیوں سے انسانی غلامی میں جکڑی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی آپ نے غلام قوموں کو یہ سبق دیا کہ :۔

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چارسو و رنگ بُو

پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو

ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رُو

اللہ تعالےٰ نے مومن کے متعلق فرمایا کہ :-

"یہ وہی جنّت ہے جسکا تمہیں ان اعمال صالح کی وجہ سے وارث قرار دیا گیا ہے۔" ($\frac{۴۳}{۷۲}$)

آج دنیا بھی ہے اور دنیا میں مسلمان بھی ہیں اس کے باوجود ملوکیت اور سرمایہ داری نے انسانوں کی گردنوں میں اپنی چیرہ دستیوں کے طوق پہنا رکھے ہیں۔ کفر و باطل نے انسان اور خدا کے درمیان دیواریں حائل کر رکھی ہیں۔ نظامِ عالم درہم برہم ہو چکا ہے نوعِ انسان وحدتِ خلق کا بنیادی اصول بھلا کر رنگ۔ نسل۔ وطن اور زبان کی غیر فطری حدود سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ مسلمان اپنے مقامات کو کھو بیٹھا ہے اپنی بلندی سے گر چکا ہے ورنہ

. . . .

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خود گیر و خود داری و گلبانگِ انا الحق !!
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اسکے مقامات

محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست
خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

عشق و مستی

حضرت ابراہیمؑ کو دھمکی دی گئی کہ اگر اپنی روش سے باز نہ آؤ گے تو قتل کئے جاؤ گے۔ یا زندہ جلا دیئے جاؤ گے۔

"تو ابراہیم کی قوم کا (اس کے سوا) کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ کہنے لگے کہ (یہ یوں باز نہیں آئے گا) اسے قتل کر ڈالو یا (آگ میں جلا دو) چنانچہ (انہوں نے ابراہیمؑ کو سچ مچ) آگ میں جھونک دیا مگر خدا نے اُسے آگ سے بچا لیا۔ (آگ اُسے کوئی گزند نہ پہنچا سکی) بلاشبہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو خدا کی حفاظت پر ایمان رکھتے ہیں بڑی بڑی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔" ۲۹/۲۴

اس ایک مثال سے آپ نے دیکھ لیا کہ ایک مومن کو اعلانِ توحید

سے کوئی قوت کوئی جبر اور کوئی استبداد روک نہیں سکتا۔ وہ موت تکلیف اور گزند کے خوف سے کسی غار میں نہیں چلے گئے تھے۔ خانقاہ کے حجرہ میں بند نہیں ہو گئے تھے۔ رہبانیت اختیار نہیں کرلی تھی۔ کسی طاغوتی قوت سے دب کر نہیں رہ گئے تھے۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ اُن کی کوئی پارٹی نہیں ہے کوئی جماعت نہیں ہے۔ کوئی اکثریت نہیں ہے اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ اُس وقت ایک محکوم کی حیثیت سے تھے۔ قانون ان کا نہیں تھا حکومت اُن کی نہیں تھی۔ زمین ان کی نہیں تھی۔ سلطنت اُن کی نہیں تھی۔ وہ خود حاکم و سلطان نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ باطل کے سامنے جھکے نہیں۔ اور آج یہ عالم ہے کہ حکومت اپنی ہے۔ قانون اپنا ہے زمین اپنی ہے۔ ملک اپنا ہے۔ اور آج مورخہ ۲۲/۵/۸۳ کو روزنامہ جنگ میں اعلان ہوتا ہے کہ گاندھی کا بت کسی وجہ سے اکھڑ کر گر گیا ہے حکومت کو اس کا افسوس ہے۔ حکومت اس کی تعمیر میں فکر مند ہے اور بہت جلد دوبارہ اس بت کو اسلامی حکومت کی آزاد فضا میں نصب کر دیا جائیگا۔ دوسری طرف اقبالؒ کا یہ اعلان ہے کہ:۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبّیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

تیرے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جلوہ
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

بے نیاز

جب فرعون کو معلوم ہوا کہ میرے خلقے سے کٹ کر کچھ لوگ موسےٰ پر ایمان لے آئے ہیں تو فرعون نے ایک روز انہیں اپنے جاہ وجلال کے دربار میں بلایا اور کہا۔

"تم بغیر میرے حکم کے موسےٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ اچھا۔ دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹوا دونگا۔ اور کھجور کے تنوں پر سولی دونگا۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے۔ اور کس کا عذاب دیرپا ہے" ۲۱/۱۷

اِس سے پہلے ان کے دلوں کے آئینے کفر و باطل کے گرد وغبار سے اٹے پڑے تھے اور اس قدر موٹی تہہ جم گئی تھی کہ آئینے کے جوہر چھپ کر رہ گئے تھے اس لئے انہیں خودی نظر نہیں آرہی تھی۔ لیکن جب ایمان کے ابرِ رحمت نے دھو کر صاف وشفاف کر دیا تو جوہر چمک گئے اور خودی کا وجود صاف نظر آنے لگا۔ فرعون کی غضبناک باتیں سنکر وہ کانپ نہیں گئے تھے بلکہ مضحکہ اڑا رہے

تھے۔ اور اپنی ایمانی قوتوں کے سامنے اس کی طاغوتی قوتوں کو خس و خاشاک سے زیادہ نہیں سمجھ رہے تھے ان کی خاموش زبانیں کہہ رہی تھیں کہ ہمارے ہاتھ پاؤں کٹ جانے سے دل کے رشتے نہیں کٹ سکتے۔ ظلم کرو تاکہ ستم کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک جائے۔ اب اُن کی آنکھوں کے سامنے آفاق بھی سرنگوں تھے۔

کھلا جب چمن میں کتب خانۂ گُل
نہ کام آیا مُلّا کو علمِ کتابی!
متانت شکن تھی ہوائے بہاراں
غزلخواں ہوا پیرکِ اندرابی!
کہا لالۂ آتشیں پیرہن نے
کہ اسرارِ جاں کی ہوں میں بے حجابی
سمجھتا ہے جو موت خوابِ لحد کو
نہاں اس کی تعمیر میں ہے خرابی
نہیں زندگی سلسلہ روز و شب کا
نہیں زندگی مستی و نیم خوابی!!!!

چہروں پر بغاوتوں کے آثار دیکھ کر فرعون کی فرعونیت تلملا اٹھی جور و استبداد کی رگوں میں فولاد پگل گیا۔ اُس نے اس سے بھی زیادہ سخت دھمکیوں پر ضرب کاری

لگائی۔ لیکن خدا کے مختصر سے لشکر نے جواب دیا کہ جب ہم محکوم و غلام تھے ہماری رگیں ریشم سے زیادہ نرم تھیں انہیں جھک جانے میں کوئی تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور انہیں جھکانے کے لئے کسی آتش و حرارت کی بھی ضرورت نہ تھی لیکن اب وہ رگیں چٹان کے پتھروں کی طرح سخت ہو گئی ہیں جن پر تمہارے تیشے بھی کند ہو جائیں گے۔ اور پھر انہوں نے قلندرانہ انداز سے طاغوتی قوتوں کو پیغام دیا کہ:۔

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پُر سوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نم ناک!!
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

پھر اس چھوٹی سی جماعت نے جو حضرت موسےٰ کے ساتھ تھی خود توحید

کی علمبردار ہو گئی ٹھیک اس وقت فرعون کی طرف سے انہیں بہکانے کے لئے ایک منظم سازش شروع ہوئی۔ فرعون نے کچھ آدمی ایسے پیدا کئے جو بظاہر حضرت موسےٰ کے حلقے میں جا ملے اور اندرونی طور پر ایمان والوں کو بہکانا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر کچھ ایسے لوگ جن کا محکم نہیں تھا کٹ کر فرعون سے جا ملے لیکن جلد ہی حقیقت سے آگاہ ہو کر توبہ کے دروازے پر جھک گئے۔ اور پکار پکار کر کہنے لگے۔

تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ
کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ بت خانہ

یہ راز ہم سے چھپایا ہے میر واعظ نے
کہ خود حرم ہے چراغِ حرم کا پروانہ

طلسمِ بیخبری کافری و دیں داری!
حدیثِ شیخ و برہمن فسوں و افسانہ

نصیب خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں حکیمانہ

چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھوں سے کب تک
گہر ہیں آبِ ولر کے تمام یک دانہ

....

اسلام کیا ہے

اقبال اور قرآن

قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیم کی تعریف میں فرمایا کہ :-

"اور پھر اس آدمی سے بہتر دین رکھنے والا کون آسکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہو اور اُس نے ابراہیم کے طریقے کی پیروی بھی کی جو صرف خدا ہی کے لئے ہو رہا تھا۔ اور (یہ واقعہ ہے کہ) اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست مخلص بنا لیا تھا (جس سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔" ۵ $\frac{4}{125}$

اس سے ثابت ہوا کہ خدا کا دوستِ مخلص بن جانا "مسلم" ہے اور اس طریق کا نام "اسلام" ہے۔ یعنی اپنی تمام خواہشات اور ارادوں کو احکام الٰہیہ کے ماتحت کر دینا۔ اس سے بہتر مسلک اور کون سا ہو سکتا ہے؟

آپ اس اجمال کی چاہے جس قدر طویل شرح کیوں نہ کرتے چلے جائیں لیکن نقطہ ماسکہ یہی مسلک ہے اور بس۔

(جب کسی قوم کے افراد خدا کے مخلص دوست بن جائیں تو پھر اس قوم کی قوتوں کا کیا حساب؟ ارادوں کا کیا ٹھکانہ؟

درحقیقت وہ قوم خدا کی ایک جماعت بن جاتی ہے۔ خدا کے ارادوں کی تکمیل کی کفیل ہوتی ہے۔ پھر یہ کائنات اور کائنات کی تجلیات ان کے تابع فرمان

ہوتی ہیں۔ یہ توم طلوعِ آفتاب کے ساتھ کسی مقام پر ہوتی ہے تو غروبِ آفتاب کے وقت کسی دوسرے مقام پر ہوتی ہے۔

نشاں یہی ہیں زمانے میں زندہ قوموں کے
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں!
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی ان کی!
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال!!!
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں!!!
خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

جب یہ خدا کا لشکر خدا کی حفاظت میں شمشیر بکف اور کفن بر دوش میدانِ کارزار میں نکلتا ہے تو ان کی ہیبت اور ان کے ارادوں کے استقلال سے آسمان بھی تھرا اٹھتا ہے۔

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
منجم کی تقویم فردا ہے باطل!
گرے آسماں سے پرانے ستارے

ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے
کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے

زمین تنگ نہیں ہے

حضرت ابراہیمؑ جب آگ سے محفوظ رہے تو اُس قوم نے اِسے جادو کا اثر سمجھا اور ایمان نہ لائے کیونکہ فسادتِ قلبی بے حد شدید ہو چکی تھی۔ اب حضرت ابراہیمؑ نے اِس زمینِ شور کو چھوڑ کر فلسطین کی طرف ہجرت فرمائی۔ جب آپ کے والد نے دھمکی دی کہ اگر تم ہمارے بتوں کی مذمت سے باز نہ آؤ گے تو میں تمہیں سنگسار کر دونگا تو آپ نے فرمایا کہ:۔

"میں نے تم سب کو چھوڑا۔ اور اُنہیں بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ میں صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں۔ امید ہے کہ اپنے پروردگار کو پکار کے میں محروم ثابت نہیں ہونگا۔ پھر جب ابراہیم اِن لوگوں سے اور اُن سب سے جن کی اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے الگ ہو گیا۔ تو ہم نے (اس کی نسل میں برکت دی اور) اُسے اسحاق اور (اسحاق کا بیٹا) یعقوب عطا فرمایا۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے نبوت دی تھی۔ اور اپنی بخشش کی رحمت سے سرفراز کیا تھا۔ نیز اِن سب کے لئے سچائی کی صدائیں بلند کر دیں۔ (جو کبھی

خاموش ہونے والی نہیں) ۔ ۵ — $\frac{۱۹}{۴۸-۵۵}$

انہی لوگوں اور ایسے ہی ایمان والوں کے لئے علامہ نے فرمایا ہے کہ

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا!
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بے کرانہ

داستانِ یوسفؑ

حضرت یوسفؑ نے اپنے باپ حضرت یعقوبؑ سے اپنا خواب بیان فرمایا کہ :۔

"اے میرے باپ میں نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ۔ اور یہ دیکھا کہ یہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں ۔ $\frac{۱۲}{۴}$

بیٹے کا یہ خواب سنکر باپ کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی ۔ باپ کو معلوم تھا کہ اس سے پہلے بھی اللہ تعالےٰ نے نبوت کی دولت سے اس خاندان کو نوازا ہے مشفق باپ نے محبوب بیٹے کو سینے سے لگالیا اور فرمایا ۔

"باپ نے کہا ۔ اے میرے بیٹے اپنے اس خواب کا حال اپنے بھائیوں سے نہ کہہ دیجیو ۔ کہ وہ تیرے خلاف کسی منصوبے کی تدبیریں کرنے لگیں گے ۔ ۵ ($\frac{۱۲}{۵}$)

اور پھر مشفق باپ نے خاندان کی عظمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے ہونہار بیٹے کو تعلیم دی کہ۔

نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمے تیرے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

جب بھائیوں کو علم ہوا کہ یوسف ایک روز ان سب سے فضیلت حاصل کرنے والا ہے تو حسد کی آگ تیز ہو گئی۔ وہ برداشت نہ کر سکے کہ ان کا بھائی بہ لحاظ عمر چھوٹا ہو کر بہ لحاظ فضیلت بہت بلند ہو جائے۔ انہوں نے ایک منظم سازش کی۔

"اور جب ایسا ہوا کہ یوسف کے سوتیلے بھائی آپس میں ملے۔ اور کہنے لگے۔ ہمارے باپ کو یوسف اور اس کا بھائی بن یامین ہم سب سے زیادہ پیارا ہے حالانکہ ہم ایک پوری جماعت ہیں۔ اور یقیناً ہمارا باپ اس معاملے میں غلطی پر ہے" $\frac{12}{8-9}$

"پس بہتر یہ ہے کہ یوسف کو مار ڈالیں یا کسی جگہ پھینک آئیں تاکہ ہمارے باپ کی توجہ ہماری ہی طرف رہے اور اس کے نکل جانے کے بعد ہمارے سارے کام سدھر جائیں"

جب یہ سازش طے پا گئی ۔ تو سب مل کر باپ کے حضور میں پہنچے ۔

"تب سب مل کر باپ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا ۔ اے ہمارے باپ کیوں آپ یوسف کے بارے میں ہمارا اعتبار نہیں کرتے ہو اور ہمارے ساتھ کہیں جانے نہیں دیتے ؛ حالانکہ ہم سب اس کے دل سے خیر خواہ ہیں کل ہمارے ساتھ اُسے جنگل میں جانے دیں کہ کھیلے کودے اور کھائے پیئے ۔ ہم اُس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں ۔" ($\frac{۱۲}{۱۲-۱۱}$)

باپ کا دل دھڑک گیا اور بیٹوں کے ارادوں پر ایک نظر ڈالی اور دل میں کہا کہ :۔

زمانہ اپنے حوادث چھپا نہیں سکتا
تیرا حجاب ہے قلب و نظر کی ناپاکی

باپ نے انہیں صاف صاف تو نہ کہا اور اسطرح کہا کہ :۔

"یہ بات مجھے غم میں ڈالتی ہے کہ تم اُسے اپنے ہمراہ لے جاؤ اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے بھیڑیا کھا جائے ۔" $\frac{۱۲}{۱۳}$ ۵

بیٹوں نے عرض کی کہ ایسا ناممکن ہے کہ ہماری موجودگی میں کوئی جنگلی درندہ یوسف پر غالب آ جائے ۔ پھر ہم تو نکمے ہوئے ۔ اس کے بعد بھائی یوسف کو اپنے ساتھ لے گئے اور خفیہ تجویز کے مطابق جاکر اندھے کنوئیں میں

ڈال دیا۔ یوسف اس تاریک کنویں میں گھبرائے اور سوچا کہ اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ دل نے جواب دیا۔

تیری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن
کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

اذانِ بلالؓ

میدانِ جنگ میں اکثر ایسا ہوا کہ مقابل کی دو صفوں میں ایک طرف رسول ؐ اللہ اور آپ کی جماعت اور دوسری طرف انہی کے عزیز و اقارب رشتہ دار۔ ہم وطن۔ ہم رنگ و ہم نسل ہوتے۔ انہی لوگوں کو خدا نے پرائے کہا ہے۔ خدا کے نزدیک پرایا وہی ہے۔ حضرت بلالؓ حبش کے رہنے والے تھے۔ نہ ہم وطن۔ نہ ہم نسل۔ نہ ہم رنگ تھے۔ لیکن اپنے اس لئے ہو گئے کہ صاحبِ ایمان ہو گئے۔ ایمان ہی آدمی کو شرفِ آدمیت کے بلند رتبوں تک پہنچاتا ہے۔ یہی ایمان معراجِ انسانیت سے ہمکنار و ہم آغوش کرتا ہے ان کے یقینِ محکم اور ایمانِ مستحکم کا اثر یہ تھا کہ جب آپ اذان کہتے پہاڑوں پر سناٹا چھا جاتا۔ علامہ نے اس حقیقت کی جانب اشارہ فرمایا ہے کہ :۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا!

نیلامِ یوسفؑ

جب حضرت یوسفؑ قافلہ والوں کے ہاتھ آئے تو انہوں نے مفت پاکر کوئی قدر نہ پہچانی۔ اور مصر کے بازار میں جاکر گنتی کے چند درہم پر نیلام کر دیا۔ اس نیلام پر فطرتِ یزداں مسکرا رہی تھی۔ یہ غلام اور اس بے قدری سے بکا ہوا غلام اس انداز سے مصر میں داخل ہوا۔ ان مہ پاینوں نے مصر میں فوطیفار کے ہاتھ جو فرعون کا ایک امیرِ لشکر تھا بیچا۔ یہ آدمی مصر میں ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت رکھتا تھا۔ قرآن نے اسے عزیز کے لقب سے یاد کیا ہے (بڑی عزت والا) لیکن تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی راست بازی۔ دیانت داری، حسن سیرت۔ اور خداداد فراست سے اس قدر نیک نام ہو گئے کہ یہی آقا (عزیز) آپ کو عزت کے ساتھ رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اور چند ہی روز میں ایک بہت بڑے صاحبِ منصب امیر کے گھر بار کے ناظمِ اعلیٰ بن گئے۔ اس طرح حضرت یوسفؑ کے قدم مصر میں جما دیئے گئے۔ اور اتنے بڑے نظم و نسق کو ان کے ہاتھ میں دے کر حسنِ تدبیر اور معاملہ فہمی کے مواقع بہم پہنچا دیئے گئے۔

ع که گرہ غنچے کی کھلتی نہیں بے موجِ نسیم!

اس دور کے بعد کاروانِ شوق اس وادی میں داخل ہوا۔ جہاں ایمان کی آزمائش کے لئے ترغیباتِ نفس کے صبر آزما اور نگاہ فریب، ناظر سامانِ خفتہ بچھا

بداماں کیئے ہوئے دامِ ہمرنگِ زمین کی طرح بکھرے اور بچھے ہوئے ہوتے ہیں حضرت یوسفؑ کی عمر اس وقت بھرپور جوانی کی تھی۔ لیکن اس جوانیؔ کی پرورش نبوت کی آغوش میں ہوئی تھی۔ قلب و نگاہ کی پاکیزگی چمک دمک فطری طور پر ورثہ میں ملی تھی۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے گہر
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

اور پھر جس سے اللہ تعالےٰ کو دنیا کی امامت کے کام لینے ہوں اُس کی فطرت تو ہزار بھٹیوں سے نکل کر کندن بنتی ہے۔

رُوحِ اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی
زندگانی کے لئے نارِ خودی نور و حضور

یہی ہر چیز کی تقویم یہی اصلِ نمود
گرچہ اِس روح کو فطرت نے رکھا ہی مستور

اس عزیز کی بیوی آپ پر فدا ہو گئی۔ اور بڑے ارادوں سے یوسف کو کمرے میں لے گئی پھر یوسف پر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ یوسف نے اپنے رب کی سلامتی کو پکارا اور وہاں سے بھاگا۔ تو عورت بھی بھاگی تاکہ اُسے بھاگ نکلنے سے روکے۔ اِس کشمکش میں پیچھے سے یوسف کا کرتہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور عین اس وقت عزیز خود دروازے پر موجود تھا۔ عورت نے مکر و فریب سے

کام لیا۔ اور اپنا سارا جرم اُس بے گناہ کے ذمہ لگا دیا۔ لیکن حضرت یوسف کا ضمیر مطمئن تھا کیونکہ آپ بے گناہ اور بے قصور تھے اور آپ نے اعلانیہ کہا کہ اس عورت کے ارادوں میں کھوٹ تھا۔ اور مجھے کمرے میں لے گئی۔ میں اس گناہ سے بھاگا۔ تو یہ مجھ پر لپکی۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ عزیز کو لامحالہ بیوی کی طرف داری منظور تھی۔ بات قبیلے میں پھیل گئی۔ آخر کار عورت کے قبیلے میں سے ایک شخص نے کہا کہ اگر کرتا آگے سے پھٹا ہے تو لڑکے کی دست درازی ثابت ہے اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو لڑکا بے گناہ ہے۔ عورت کی دست درازی اس سے ظاہر ہے۔

۵ عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تیری
بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا!

اس گواہی سے عورت کا جرم ثابت ہو گیا۔ اس پر عزیز کو کچھ غیرت نہ آئی۔ اور نہ ہی عورت کی پیشانی پر شرم و حیا کے قطرے نمودار ہوئے۔ زیادہ سے زیادہ یوسف سے صرف اس قدر کہا گیا کہ دیکھنا صاحب زادے یہ بات اس سے زیادہ باہر نہ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیرت ضبطِ نفس سے پیدا ہوتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب تہذیب کی بنیاد ایمان یا اللہ کی بنیادوں پر استوار ہو۔ جہاں ایمان نہ ہو گا وہاں غیرت نہ ہو گی اور غیرت ہوتی ہے آزاد قوموں میں۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

وہ عورت اس کے بعد بھی باز نہ آئی اور ایک روز حضرت یوسفؑ کو بلا کر کہنے لگی میں تمہیں قید خانے میں بند کر دوں گی ورنہ میری خواہش کو پورا کرنے کا عہد کرو۔ پھر ایک نئی آزمائش شروع ہوئی۔ یوسف نے کہا۔ خدا سے ڈرو اس کا غضب بہت بڑا ہے۔ عورت نے کہا۔ مجھے کیا معلوم خدا کہاں ہے اور کیسا ہے میرا خدا میرے گھر میں (بت) ہے اور وہ میرے قبضے میں ہے۔ حضرت یوسفؑ نے پھر سمجھایا کہ میرا خدا آسمان پر ہے ہر شے پر قدرت رکھتا ہے ہر شے کے نزدیک ہے اور وہ سب کچھ سنتا ہے اور دیکھتا ہے۔ وہ رحم کرنے والا بھی ہے اور غضب دینے والا بھی۔ عورت نے کہا میں تیرے خدا کے وجود کو نہیں دیکھتی۔ مجھ سے ایسی بحث نہ کر۔ یوسف نے کہا

تیری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
میری نگاہ میں ثابت نہیں وجود تیرا
وجود کیا ہے۔ فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود تیرا

عورت نے کہا۔ سنو۔ ایک طرف محل کی آرام زندگی ہے۔ ہر ایک پر حکومت عزت و وقار۔ دولت و حشمت۔ اور دوسری طرف جیل اور اس کی

مصیبت۔ اب تمہیں اختیار ہے جو چاہے پسند کر لو۔ حضرت یوسفؑ نے آسمان کی طرف دیکھا اور بے اختیار کہہ دیا کہ مجھے جیل اور اس کی مصیبت پسند ہے یہ سنکر عورت نے طعن سے کہا۔ تمہارے پاس کونسی قوت ہے کہ تم اپنے خدا کا پرچار کر سکو۔ دیکھو میرے پاس قوت ہے اور جسے تم پتھر کہتے ہو میری قوت کے خوف سے دنیا اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اور پھر طعن سے کہا۔

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

اور پھر اس عورت نے کہا۔ تم۔ حکومت۔ سلطنت اور راحت و آرام کو ٹھکرا کر قید خانے کی مصیبتوں کو کیوں پسند کر رہے ہو! وہاں تمہیں کونسی جنت نظر آ رہی ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا۔

تیرا بحر پر سکوں ہے۔ یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابیِ کنارا!
تو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بے قرار کرتا تجھے غمزۂ ستارا

نظر آئے گا اُسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسر مری شوخیٔ نظارا

جب وہ عورت مایوس ہو گئی تو آخر کار حضرت یوسف کو قید خانے میں ڈال دیا (خدا فراموش موسائٹی میں حق و انصاف کی اسی طرح مٹی پلید ہوا کرتی ہے)

محلات کے نظم و نسق کا کارفرما یوسف اب قید کی مصیبتیں جھیلنے لگا اور اس جرم میں کہ اپنے جذبات پر قابو کیوں رکھا۔ اور جذبات کو مشتعل کر دینے والے اسباب میں اللہ کو یاد کیوں رکھا۔

عزیز کی بیوی نے طاغوتی قوتوں کے صدقے میں یوسف کو تہ خانے میں بند تو کر دیا۔ لیکن دل کی بے چینی میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے خفیہ آدمی چھوڑے کہ یوسف کے متعلق ایک ایک لمحہ کی خبر دیتے رہیں۔ اُدھر حضرت یوسفؑ نے قید میں بھی اعلانِ حق سے گریز نہ کیا اور اپنے ساتھیوں کو دعوتِ توحید دیتے رہے۔ ایک مخبر نے آ کر اُس عورت کو خبر دی کہ :۔

مرقد کا شبستاں بھی اسے راس نہ آیا
آرام قلندر کو تہِ خاک نہیں ہے
خاموشیٔ افلاک تو ہے قبر میں لیکن!!!
بے قیدی و پہنائیٔ افلاک نہیں ہے

ایک روز وہ عورت بندی خانے میں پہنچی۔ اور اپنے محبوب یوسف سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران میں اس نے اپنے اختیارات کی دنیا کے سبز باغ دکھائے۔ اور کہا کہ صرف ایک ہاں پر اِس تاریکی سے میں تمہیں اپنی منور دنیا میں لے جاؤں گی۔ اِس کے جواب میں آپ نے کہا کہ تیری دنیا ہیں۔

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی
باہر نہیں کچھ عقلِ خدا داد کی زد سے
عالم ہے غلام اِس کے جلالِ ازلی کا
اک دل ہے کہ ہر لحظہ الجھتا ہے خرد سے

ایک رات مصر کے بادشاہ نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا جس کی تعبیر بتانے سے دربار کے اہلِ دانش عاجز آ گئے۔ خواب یہ تھا۔

"اور پھر ایسا ہوا کہ بادشاہ نے اپنے درباریوں کو جمع کر کے کہا۔ میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ سات گائیں ہیں موٹی تازی۔ انہیں سات دبلی پتلی گائیں نگل رہی ہیں۔ اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی۔ اے اہلِ دربار! اگر تم خواب کا مطلب حل کر لیا کرتے ہو تو بتاؤ۔ میرے خواب کا حل کیا ہے۔ درباریوں نے غور کے بعد کہا کہ پریشان خواب صرف خیالات ہیں۔ کوئی ایسی بات

نہیں جس کا کوئی خاص مطلب ہو۔ سچے خوابوں کا تو مطلب حل کر سکتے ہیں۔ لیکن پریشان خوابوں کا حل نہیں جانتے۔" ۱۲/۴۳-۴۴
جب اس کا چرچا عام ہوا تو بادشاہ سے ایک شخص نے کہا کہ بندی خانے میں ایک شخص یوسف نامی ہے۔ وہ اس فن میں ماہر ہے چنانچہ وہ قید خانہ میں گیا اور یوسف سے کہا۔ کہ تیری سچائی کی بڑی دھوم ہے۔ تو ہمارے خواب کی تعبیر بتا۔ یوسف نے اس شخص کو بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتادی اور ساتھ ہی تدبیر بھی بتادی۔ جب بادشاہ نے اس کی تعبیر اور تدبیر کا حال معلوم کیا تو یوسفی تدبیر کے جوہر آشکارا ہو گئے۔ بادشاہ نے اُسے بندی خانے سے آزادی کا حکم بھیجا۔ قاصد حکم لے کر یوسف کے پاس گیا تو یوسف نے کہا کہ بادشاہ کی توجہ فرمائی کا شکریہ۔ لیکن میں اُس کے رحم و کرم کے صدقے میں یہاں سے رہائی نہیں چاہتا۔ پہلے اپنے بادشاہ سے کہو کہ میرے معاملے کی تحقیق کرے۔ میں نے اس کے خواب کی تعبیر بتادی ہے اور تدبیر بھی اس کے علاوہ جو اسکے دماغ میں شکوک ہیں میں ان سے بھی واقف ہوں۔

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گذرا تھا اسی راہ گذر سے

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا!
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
پیدا ہے فقط حلقۂ اربابِ جنوں میں!!
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے
جس معنیٔ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے

قاصد نے جاکر بادشاہ کی خدمت میں لفظ لفظ کہہ دیا۔ درباری کھڑا اٹھے کہ نظر بند کی موت کا وقت آگیا ہے کیونکہ وہ بادشاہ کے مزاج سے آگاہ تھے۔ یہاں قدرت کچھ اور ہی کرشمے دکھا رہی تھی۔ بادشاہ کی جوہر شناس نگاہ نے کندن کو پہچان لیا۔ معاملہ کی تحقیق ہوئی تو یوسف قطعی بے گناہ ثابت ہوئے۔ عزیز کی بیوی نے بھی اعلانیہ اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا۔ اب تو یوسف کی پاکیزگی اور درخشندگی نے ہر دل میں عظمت و احترام کی جگہ بنالی۔ پھر یوسف کو آزاد کیا گیا اور بادشاہ نے کہا کہ اے یوسف تو ہماری نظروں میں بڑا ہی دیانت دار انسان ہے۔ پھر بادشاہ نے کہا کہ سلطنت کے کاروبار میں جو شعبہ پسند ہو اختیار کرلو۔ یوسف نے امورِ سلطنت پر ایک نگاہ ڈالی اور مملکت کے خزانوں کا انتظام سنبھال لیا۔

....

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِّ سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی!

نظیرِ عزم

جب قریش کا قافلہ شام سے واپس آرہا تھا تو کسی نے امیرِ کارواں ابوسفیان کو غلط اطلاع دی کہ مسلمان تمہارے قافلہ کو لوٹنے کی فکر میں ہیں۔ اس سردار نے اس خبر کی اطلاع قریش مکہ کو بھیجدی۔ وہ پہلے ہی بہانہ جُو تھے۔ فوراً لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور ایک لشکرِ جرار۔ لے کر مدینہ کی جانب امڈ آئے۔

نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا تو آپ نے اصحابہؓ سے صلاح مشورہ کیا۔ اُن میں سے ہر ایک نے کہا کہ اگر آپ حکم دیں تو ہم سمندروں میں کود پڑیں اِسوقت

ان جاں نثاروں کی کل تعداد ۳۱۳ تھی۔ لیکن قدرت کے نزدیک میدانِ جنگ کی فتح و شکست آدمیوں کی گنتی پر موقوف نہیں ہے آدمیوں کے اعمالِ صالح پر مبنی ہے۔ پھر یہ جماعت تو خالص خدا کی جماعت تھی۔ اگرچہ خدا کے نام لینے والوں کی کل کائنات یہی گنتی کے ۳۱۳ تھے جو حق و صداقت کے ساتھ اپنے دعوہ ایمان کی شہادت کے لئے چل دیئے تھے۔ اس جماعت کے پاس کُل دو گھوڑے تھے۔ اُن کے ساتھ ہزار سپاہیوں کی جمیعت۔ سو سواروں کا رسالہ۔ تمام امرائے قریش شریک تھے۔ رسد کا یہ بندوبست تھا۔ کہ ہر روز دس دس اونٹ ذبح ہوتے تھے دشمن کا جمِ غفیر دیکھ کر چند اصحاب نے آسمان کی طرف دیکھا تو حضورؐ نے فرمایا کہ آسمان کا مالک اسُی کے ساتھ ہے جو زمین پر اپنی حفاظت آپ کرتے ہیں۔

نظر سپہر پہ رکھتا ہے جو ستارا شناس
نہیں ہے اپنی خودی کے مقام سے آگاہ
خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکتِ صبح و شام سے آگاہ

سترہ[۱۷] رمضان سنہ ۲ھ (مطابق ۱۳ مارچ سنہ ۶۲۴ء) کی صبح بدر کے میدان میں حق و باطل کی دو صفیں نبرد آزما ہوئیں۔ ایک طرف مختصر سے ۳۱۳ افراد اور ان کے پاس معمولی تلواریں اور صرف دو گھوڑے۔ دوسری طرف لشکرِ عظیم۔۔۔

فولادی شمشیریں - اور پورے سامان - لیکن ان ۳۱۳ افراد کا یہ عالم تھا کہ ان میں ایک کمسن بچہ (عمیر بن ابی وقاص) تھا جس کے گلے میں اس کے بڑے بھائی سعد بن ابی وقاص نے تلوار حمائل کی تھی - تڑپ تڑپ کر صف سے آگے نکل جانا چاہتا تھا - کئی بار ساتھیوں نے پکڑ کر صف میں کھڑا کیا - اور جب اُس سے پوچھا کہ کیا تم سے اتنی بھاری تلوار اٹھ بھی سکے گی؟ تو اُس نے جاہ وجلال کے ساتھ جواب میں عرض کیا - میں دشمن پر فتح حاصل کرنے آیا ہوں - اور اُس کے لئے تلوار ضروری نہیں ہے -

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وُہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد

مقام اپنا

علامہ اقبالؒ نے قوم کو اُس کے حقیقی مقام سے چند اشعاروں میں روشناس کیا ہے - اور اعلان کیا ہے کہ یہ سب کچھ میرے لئے نہ ہے - اور میرے ہی

دم سے بارونق ہے۔

کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی
تو میری نظر میں کافر میں تیری نظر میں کافر
تیرا دیں نفس شماری میرا دیں نفس گدازی!!
تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت
کہ موافقِ نذرواں نہیں دینِ شاہبازی!
تیرے دشت و در میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا!
کہ سکھا سکے خرد کو رہ و رسم کارسازی!
نہ جدا رہے نوا گر تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکی اُمم ہے یہ طریقِ نے نوازی!!!

صاحب آفاق

اس جنگِ بدر میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جب مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ دشمن زیادہ طاقت میں آرہے ہیں تو انہوں سے مشورہ کیا کہ جنگ کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہو یا دشمن کو شہر پر حملہ کرنے دیا جائے۔ اور اُس کی مدافعت شہر سے ہو؟

اس فیصلے پر بہت سے مسلمان بگڑ گئے اور میدانِ جنگ میں جانے

سے کترانے لگے۔ اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کو حق کی صداقت کے لئے میدانِ جنگ میں فیصلہ کرنا ہے وہ مسلمان جن کا ایمان محکم اور یقین کامل تھا۔ حضورؐ کے ہمراہ ہو گئے اُس وقت حضورؐ کے ساتھیوں نے فرمایا کہ جو لوگ میدانِ جنگ کو پسند کریں گے وہ صاحبِ آفاق ہوں گے۔ کیونکہ بندۂ آفاق ہماری شان نہیں ہے۔

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے بُرّندہ و بُرّاق!!!
اُس کی نگہِ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوتِ اشراق
اُس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق!

تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی
وہ پاکیٔ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق

میدانِ جنگ میں جس چیز پر فتح و شکست کا مدار ہے۔ وہ سپاہی کی روح ہے۔ اگر اسے اپنی کامیابی پر یقین ہے اگر جمعیت خاطر نصیب ہے تو میدان مار سکتا ہے یہی وہ دولت تھی۔ یہی تو دل کا اطمینان تھا یہی وہ پختگی ارادہ تھی جو اللہ نے آسمان سے ان کے دلوں میں نازل فرمائی

جیسے رحمت کے فرشتے کہہ لیجئے یا قوتِ آسمانی یا اعجازِ الٰہی۔ بہرحال یہ فتح ایک کرشمہ تھا۔ زندہ خودی کا۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ یہ جماعت اسی وطن کی تھی۔ ان کی رگوں میں بھی وہی خون تھا۔ جو باطل کے لشکرِ جرار کی رگوں میں موجزن تھا۔ پھر ان گنتی کے آدمیوں میں زندگی کی بجلیاں کس نے بھر دیں؟ اس مٹھی بھر جماعت کے سینوں میں فکر و تدبر کا سلیقہ کس نے ودلیعت کر دیا تھا؟ ہاں یہی وہ فکر و تدبر تھا جس نے سوزِ محمدؐ سے حرارت پائی تھی۔ ورنہ۔

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار!!
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

اور یہی وہ جماعت تھی۔ جس نے حضورؐ کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی۔ اسی تربیت کے فیض سے ان کی تاریک راہیں نورِ زندگی سے

منور ہوتی چلی گئیں۔

خودی کی پرورش و تربیت پر ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز!
یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اِک زمانے میں!
ہوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز

زندہ کرامات

خبر ملی ہے کہ بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہے اس خبر سے بے ایمان مسلمانوں کے دل ڈوب گئے ہیں۔ ان کے سامنے افراد کی تعداد اور مادہ قوتوں کی زیادتی ہے۔ لیکن اپنے اندر جوہرِ خودی کی نمود سے قاصر ہیں۔ انہیں باور نہیں آتا کہ حق ہمیشہ باطل پر غالب رہا ہے۔ اگر جنگ صرف حق و صداقت کی حفاظت کے لئے کی جائے تو صرف ایمان والوں کے لئے مقدر ہو جاتی ہے۔ لیکن۔ انہیں تو مغرب کی تعلیم نے اسلامی تعلیم و تربیت سے کوسوں دور رکھا ہے۔ پھر یہ نکتہ ان کی سمجھ میں کیسے آجائے۔

. . . .

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا!!
موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

نشیب و فراز

جنگِ بدر کی حقیقت کے بارے میں اللہ نے سورۃ آلِ عمران میں ارشاد فرمایا ہے۔

"بلاشبہ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں (حکمِ حق کی فتمندیوں کی) بڑی بڑی نشانی تھی جو (بدر کے میدان میں) باہمہ گیر مقابل ہوئے تھے۔ اس وقت تو ایک گروہ (مٹھی بھر بے سروسامان مسلمانوں کا تھا) اللہ

کی راہ میں لڑ رہا تھا۔ دوسرا منکرین حق کا تھا جنہیں مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان سے دو چند ہیں (بایں ہمہ منکرین حق کو شکست ہوئی) اور اللہ جس کسی کو چاہتا ہے اپنی نصرت سے مددگاری پہنچاتا ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو چشم بینا رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں بڑی ہی عبرت ہے۔" ٥ (۳/۱۲)

اس مومنین کے گروہ کی فتح اس لئے ہوئی کہ ان کے ارادوں میں استحکامت اور نیتوں میں اٹل فیصلے آ گئے تھے۔ یہی تخیلات بلند ہوں تو ارادے فتح میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اگر نشیب میں پرورش پائیں تو زوال کا آئینہ دار ہو جاتے ہیں۔

ستارگانِ فضا ہائے نیلگوں کی طرح
تخیلات بھی ہیں تابعِ طلوع و غروب
جہاں خودی کا بھی ہے صاحبِ فراز و نشیب
یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب
نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب

مسلمان مقدرات کے فراز سے اتر کر زوال کے نشیب میں پناہ لے چکا ہے پستیوں کے دامن میں سانس لے رہا ہے۔ اور نفس شماری میں موت کے وقت تعین کا منتظر ہے۔ مسلمان ساری دنیا کا امام مسلمان آج ساری دنیا میں ذلت کی زندگی

بسر کر رہا ہے۔ اسی ذلت کو قرآن نے غلامی سے تعبیر کیا ہے۔ اگر کہیں چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے وارث مسلمان ہیں بھی تو ان کا لقب شہنشاہ ہے وہ بادشاہ ہیں۔ وقت کے امیر نہیں ہیں۔ امتوں کے امام نہیں ہیں ان کی سطوت کا دوسرا نام دورِ چنگیزی ہے۔ اور یہ مرض کسی محدود خطہ زمین پر مہلک جراثیم کی پرورش نہیں کر رہا۔ بلکہ مشرق و مغرب میں مزاج کی یہی کیفیت ہے۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر!!
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامہ احرام

بجرِ بیکراں

جنگِ احد میں حضورؐ کے ساتھ سات سو ہمراہی تھے ان میں سے کمسن بچوں کو واپس کر دیا گیا۔ جب رافع بن خدیج سے کہا گیا کہ تم چھوٹے ہو واپس

چلے جاؤ۔ تو وہ پنجوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد بڑا نظر آئے ذوقِ شہادت کی انتہا پر اذنِ معیت مل گئی۔ ایک دوسرا بچہ سمرۃ بھی بضد ہوا کہ جب مجھ میں رافع سے زیادہ طاقت ہے تو مجھے محروم کیوں رکھا جاتا ہے چنانچہ اُن کی کشتی ہوئی تو واقعی سمرۃ نے رافع کو پچھاڑ دیا۔ اس بنا پر سمرۃ کو بھی اذنِ معیت دی گئی۔ یہ تھے وہ مسلمان اور ان کی گھریلو تربیت کا نتیجہ کہ بچے پیدائشی مجاہد پیدا ہوتے تھے۔ ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کئے بحرِ بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

عورت اور اسلام

اسی جنگِ احد میں کئی ایک خواتین نے بھی حصہ لیا حضرت عائشہؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ مشکیں بھر بھر کے لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں حضرت اُم عمارہؓ کے متعلق ہے کہ جب نبی اکرمؐ کو دشمنوں نے نرغہ میں لے لیا تو

آپ نے سپر بن کر حضورؐ کو اپنی اوٹ میں لے لیا اور تیروں کی بوچھار کو اپنے اوپر روکنے لگیں۔ جب حضورؐ کی شہادت کی خبر (غلط خبر) مدینہ پہنچی تو وفا شعار خواتینِ اسلام بے تابانہ گھروں کے اندر سے نکل آئیں اور میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ حضرت حمزہؓ کی شہادت کی خبر سنکر اُن کی بہن حضرت صفیہؓ آئیں تو حضورؐ نے لاش پر جانے کے لئے روک دیا کہ شاید لاش کو اس حالت میں دیکھ کر ضبط نہ کر سکیں۔ لیکن انہوں نے بڑے استقلال سے فرمایا کہ مجھے سب حال معلوم ہو چکا ہے۔ یہ خدا کی راہ میں کوئی بڑی قربانی نہیں ہے میں خود قربان ہونے کے لئے تیار ہوں چنانچہ ضبط کا یہ عالم دیکھ کر حضورؐ نے اجازت دیدی۔ آپ لاش پر گئیں اور لاش کے منتشر ٹکڑوں پر فاتحہ کہہ کر چپ چاپ واپس چلی گئیں یہ سب اسلام کی تعلیم کا فیض تھا۔ ورنہ اُس زمانہ کی کافر عورتیں خونخواری میں مشہور تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب نورِ اسلام انسان کے وجود کو روشنی بخشتا ہے تو پھر اللہ کی رضامندیاں چھپی نہیں رہتی۔

تیری خودی سے ہے روشن تیرا حریم وجود
حیات کیا ہے اُسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اُسی کا مقام
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات

....

جہنمی

اسی جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے قزمان نامی شخص لڑا اور کفار قریش کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اکیلے نے سات آٹھ مشرکوں کو قتل کیا۔ اصحابہؓ اس کی دلیری پر خوش ہوئے اور حیران ہوئے کہ حضورؐ کا فیصلہ کر رہا ہے کہ یہ شخص جہنمی ہے لیکن آج تو یہ جنت کا مالک نظر آتا ہے۔ چنانچہ صحابؓ اس کے پاس گئے وہ زخم کھا کر گر پڑا تھا۔ صحاب نے مبارک باد پیش کی اور شہادت دی کہ اس نے اسلام کی خاطر بہت بڑا کام کیا ہے۔ اس پر قزمان نے کہا یہ تو کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ یہ تو مکہ اور مدینہ کی باہمی جنگ تھی میرا فرض تھا کہ میں اپنے وطن کی طرف سے لڑتا آپ کی جگہ کوئی اور ہوتے تو بھی میں یہی کرتا۔ مجھے قومی حمیت نے ابھارا۔ میں میدان میں نکل آیا اور وطن کے دیوتا پر قربان ہو گیا۔ اب اصحابہؓ کی سمجھ میں آیا کہ اللہ کی راہ میں سر کٹانے اور وطنیت پر سر کٹانے کا کتنا بڑا فرق ہے ورنہ وہ مرنے والا واقعی جہنمی ہے۔ جب تک نیت اور ارادے نیک نہ ہوں۔ عمل میں صالحیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی صالحیت خودی کا نور ہے۔ اسی ہنر سے خودی کی تعمیر ہے۔ ؎

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود!

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

اسلام اور آرٹ

یہ موضوع اس قابل ہے کہ اس پر الگ ایک کتاب لکھی جائے۔ لیکن اسوقت اسے فقط علامہؒ کی نگاہ تک محدود رکھنا بہتر ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ حسنِ معاملہ میں ایک دوسرے سے احسان کرو۔ اسی ایک لفظ "احسان" میں ساری تفسیر سمٹ کر آگئی ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک فوٹو گرافر کے پاس تصویر کھچوانے جاتے ہیں۔ دو روپیہ پر معاملہ ہو جاتا ہے۔ اب اس اجرت میں یہی کافی تھا۔ کہ وہ آپ کو پہلا عمل (نیگیٹو) دیدے۔ لیکن وہ اس کے بعد پرنٹ نکالتا ہے اور پھر اپنے علم و ہنر اور فنِ تصویر کشی کے جوہر عطا کرتا ہے جب وہ دیدہ زیب ہو جاتی ہے تو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ اسی کا نام احسان ہے۔ اسلام نے آرٹ کا احترام کیا ہے۔ لیکن اس حد تک کہ تصویر مصور کے فن کی منت پذیر رہے مصور یا کوئی دوسرا اس میں جذب نہ ہو جائے۔ اس جذب ہونے کا نام شرک ہے اور یہ خطرہ اس وقت لاحق ہوتا ہے جب مصور کی خودی بلند نہیں ہوتی۔

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد عجمی بھی !!

مجھکو تو یہی غم ہے کہ اِس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی

معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تُو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی!

سامانِ موت

آزاد مرد جس نے اللہ کی اطاعت کے علاوہ کسی کی اطاعت قبول نہ کی ہو وہ موت سے کبھی گریز نہیں کرتا۔ پھر یہ بھی برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی موت کے سامان میں کسی قسم کی ذلت ہو۔ وہ خوش ہوگا کہ اُس کی موت عمدہ۔ آزاد اور تابناک ذرائع سے عمل میں آئے۔ وہ کند۔ زنگ آلود اور مردہ چھری سے ذبح ہونے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ اُس کی خودی کا تقاضہ ہوگا کہ تلوار نہایت حسین چمکدار اور تاب ناک ہو۔ اُس میں جلال بھی ہو۔ اور جمال بھی۔

خودی بلند تھی اُس خوں گرفتہ چینی کی
کہا غریب نے جلاّد سے دمِ تعزیر

ٹھہر ٹھہر کہ بہت دلکشا ہے یہ منظر
ذرا میں ــ دیکھ تو لوں تانبا کی شمشیر

انقلاب

حضرت علامہؒ نے دورانِ یورپ میں نفسیات کا مطالعہ کیا۔ اِس سے آپ مشرقی زاویہ نگاہ سے بخوبی آگاہ ہو چکے تھے اور نہایت مایوس ہوئے تھے۔ انہیں کچھ امید تھی کہ یورپ میں زندہ قومیں ہیں شاید وہاں ہی انسانیت کی جھلک نظر آئے۔ لیکن وہاں جا کر بھی مادی انقلاب کی شورش نظر آئی۔ دیکھا کہ دنیا موجودہ نظام سے تنگ آئی ہوئی ہے۔ اور کوئی نیا دور اس کی جستجو کا شکار ہونے والا ہے۔ علامہ کی نگاہِ دور رس نے دیکھ لیا کہ وہ نیا دور بھی انسانیت کی حدوں سے بہت دور ہو گا۔ اِس انقلاب میں چند لیڈروں کی موت ہو گی۔ چند بستیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن نظامِ شیطانیت اسی انداز سے مسلط رہے گا۔ کوئی خدا کا راز داں نہ یہاں ہے نہ وہاں۔

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات!
خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

بلند کردار

جنگ احزاب میں کفار نے حضرت خبیب کو گرفتار کر لیا اور جا کر اہلِ مکہ کے پاس فروخت کر دیا۔ حضرت خبیب نے جنگِ احد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا۔ انہیں اُس کے لڑکوں نے خرید لیا کہ یوں اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے سکیں گے۔ چنانچہ یہ لڑکے انہیں ایک روز باہر لے گئے اور کہا کہ قتل ہو جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ آپ نے کہا کہ مجھے صرف نماز ادا کر لینے دو۔ وہ مان گئے۔ حضرت خبیب نے زندگی میں پہلی بار نماز کو جلدی جلدی ختم کیا اور نماز سے فارغ ہو کر آپ نے کہا کہ جی تو چاہتا تھا کہ اللہ کی نماز اطمینان سے ادا کروں جبکہ میری یہ آخری نماز تھی۔ لیکن مجھے خوف تھا کہ تم میرے متعلق بدگمان نہ ہو جاؤ۔ اور یہ نہ سمجھ لو کہ موت سے ڈرتے ہوئے نماز لمبی کر دی ہے۔ اللہ اکبر۔ تلوار کے نیچے گردن رکھ کر اس قدر اطمینانِ قلب؟ یہ صرف تعلیم صالح یعنی ایمانِ محکم ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اگر اسی ایمان کو وسوسوں میں تبدیل کر دیا جائے تو انسان کی خودی ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے انگریز نے کہا ہے۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اِک ڈھیر

رُوحِ مضطرب

نبی اکرمؐ نے جن اضطراری حالات میں مکہ کو چھوڑا تھا وہ سب پر عیاں تھا کعبہ چونکہ حرکت و عمل اور تمام تگ و تاز کا مرکز اور منتہیٰ تھا اس لئے مدینہ میں آنے کے بعد بھی وہ حضورؐ کی تمناؤں کا مرکز اور مہاجرین کی آرزوں کا محور بنا رہا۔ آپ کا جسم یہاں تھا لیکن روح وہاں تھی۔ مہاجرین کی ہر نگاہ کا تار اسی قبلہ مقصود سے وابستہ تھا۔ ان کے دل کی ہر خلش اسی مرکز سے ہم آہنگ تھی۔ انہیں یقین کامل تھا کہ یہ قافلہ ایک نہ ایک روز دوبارہ فاتح کی حیثیت سے اپنے مرکزِ حیات میں داخل ہوگا۔ یہ قافلہ جب تک مدینہ میں رہا ایک سانس بھی تو خودی کی پرورش سے غافل نہیں رہا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے پھر انہیں خانہ کعبہ کی کنجیوں کا مالک بنا دیا۔

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

خدا کا ہاتھ

حضورؐ نے عمرہ کا ارادہ کیا تو آپ کے ہمراہ چودہ سو اصحابؓ نے بھی احرام

باندھ لیا۔ چنانچہ یہ کاروانِ شوق دیارِ محبوب کی جانب روانہ ہوا۔ اس قافلہ کی اطلاع قریش کو پہنچی تو وہ خواہ مخواہ جنگ کی تیاریاں کرنے لگے حضورؐ نے کہلا بھیجا کہ ہم عمرہ کی نیت سے آئے ہیں۔ اور پھر عرب تو اس ماہ میں لڑائی نہیں کرتے۔ لیکن قریش نے ایک دستہ فوج کا بھیجدیا۔ یہ دستہ آسانی سے مسلمانوں نے قید کر لیا لیکن ان کے معافی مانگنے پر انہیں رہا کر دیا گیا یہ بھی مسلمانوں کے ظرفِ عالی کی دلیل تھی۔ اور پھر اس کے بعد گفتگوئے صلح کے لئے۔ حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا تو قریش نے انہیں گرفتار کر لیا یہ انتہائی بدعہدی تھی۔ اور پھر مشہور کر دیا کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر ڈالا گیا ہے۔ یہ خبر سنکر حضورؐ نے اصحاب کو جمع کیا اور ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بیعت لی انہوں نے حضورؐ کی شہادت میں خدا کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور حلف وفاداری اٹھایا کہ خدا کی راہ پر سب کچھ قربان کر دیں گے۔ اس زندگی کے انقلاب نے خدا کو مجبور کر دیا کہ نصرت و کامرانی ان کے مقدر میں لکھدے۔

تیری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے

بھوک اور ایمان

اسلام اور اسلامی جماعت یا اسلامی نظام دنیا کی تمام قوتوں پر کیوں غالب

ہے؟ اس کے نظام کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو اس کے حلقے میں آجائے حکومت کا فرض ہو جاتا ہے کہ اس کی ضروریات کا خیال رکھے۔ حکومت کا یہ فرض کہ تمام مومنین کی ضروریات کا خیال رکھے۔ اور ہر مومن کا یہ ایمان کہ اس کا سب کچھ اللہ (حکومت) کے لئے ہے۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نظام کے ماتحت کسی گھر کے چولھے میں آگ نہ جلے۔ جونہی یہ نظام ختم ہوا دنیا دو طبقوں میں منقسم ہوئی۔ بھوک اور امارت کے دو طبقوں میں۔ اور جب روٹی کے ذریعہ کسی کے قبضے میں آجائیں تو وہ دوسرے انسانوں کی گردنیں اپنے حضور میں جھکا سکتا ہے۔ اسی غیر الٰہی قوتوں کے سامنے جھکنے کا نام شرک۔ کفر اور بے ایمانی ہے۔ اسی نظام میں افلاس کا دور نمود پاتا ہے۔ اور یہی حاجت انسانوں کو غلامی پر مائل کر دیتی ہے۔ شیروں کو لومڑی بنا دینا اس حاجت کا ایک ادنےٰ کرشمہ ہے

حاجت سے مجبور مردانِ آزاد
کرتی ہے حاجت شیروں کو رُوباہ

محرم خودی سے جس دم ہوا فقر!!
تُو بھی شہنشاہ میں بھی شہنشاہ!

رسم تقلید

سنّت کیا ہے؟ نبی اکرمؐ۔ دیگر پیغمبروں اور اصحاب کرامؓ کی مقدس و محترم

عادات وخصائل کی تقلید۔ یہ تقلید خواہ کتنی ہی کہنہ کیوں نہ ہو۔ ہر زمانے میں حیاتِ نو کی تعمیر کا سنگِ بنیاد ہے۔ اسی نقطہ نظر سے علامہؒ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمان کو اس تقلید پرستی سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ یہ جذبہ بڑا احسن ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی تاکید فرمادی ہے کہ تقلید صرف اسلامی دستورِ حیات کی واجب الاحترام ہے ورنہ دورِ حاضرہ کی تقلیدِ فرنگ ایک زہر ہے۔ سمِ قاتل ہے۔

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اسکی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ!

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازہ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

اسکے بغیر

ہندی مسلمانوں میں اگر کہیں تو غیرت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں تو افغان قبائل کے آزاد پٹھانوں میں۔ انگریز کے تمام جتن بے بس ہو کر رہ گئے مگر وہ آزاد قبائل غلامی کے آستاں پر سر نہ جھکا سکے۔ انگریز نے دوسرا حربہ استعمال کیا یعنی اپنی تہذیب کے جراثیم ان میں داخل کرنے شروع کیئے۔ مگر یہ بھی کامیاب نہ ہوا۔ تو اس نے ہندو ذہنیت سے کام لیا۔ کانگریس کے مہلک

خیالات ان تک پہنچائے گئے اور وطن کا راگ الاپ کر انہیں اپنے زمرے میں شریک کر لیا۔ بظاہر انہیں انگریز کے خلاف اُکسایا گیا۔ یہ بھولا مسلمان آزادیِ وطن کے فریب میں آ گیا۔ اور کانگریس کے دامِ فریب میں پھنس کر اپنی خودی کو گرفتار کروا بیٹھا۔ اِس کا اِسے احساس تک نہ ہوا۔ عبدالغفار خاں ان کا پیشوا مقرر کر دیا گیا۔ اِس ملّت فروش انسان نے اسلامی جوہر کو کانگریس کے تیزاب میں ڈال کر گوہرِ خودی کی آب وتاب کو اِس طرح نابود کیا کہ ان کے سینوں میں خودی کی ایک کرن تک باقی نہ رہی۔ اور یہ تمام سرحدی علاقہ جس کی غیرت وحمیت پر مسلمانانِ ہند کو ناز تھا ہندی بن کر رہ گیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف تو اُن کی طاقت ختم ہونے سے انگریز مطمئن ہو گیا اور دوسری طرف ملّتِ اسلامیہ کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے انتہائی دشمن ہو گئے۔ مسلم لیگ انہیں برادرانہ دعوت دیتی رہی۔ اور وہ اِس تحریک کو پامال کرنے میں ہمہ تن مصروف رہے چونکہ اس کی وہ ملی غیرت جس کی تپش سے باطل خاکستر ہو جاتا ہے کسی منظم سازش کے دباؤ میں آ کر دب چکی تھی۔ اِس لئے اِسے قومی اور ملی تنظیم کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ اِس کی اِس موت سے متاثر ہو کر حضرت علامہؒ نے اِس آزاد قوم کے غیرت مند نوجوانوں کو مخاطب کیا۔

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستاں اپنی خودی پہچان !!!

اپنی خودی پہچان او غافل افغان!!

موسم اچھا پانی وافر مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

اپنی خودی پہچان او غافل افغان

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان

اپنی خودی پہچان او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان!

اپنی خودی پہچان او غافل افغان

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان

اپنی خودی پہچان او غافل افغان!

خودی کی موت

کتاب اللہ کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ خودی صرف مسلم کے لئے ہے غیر مسلم کے لئے نہیں ہے خودی کے کچھ عنصر ایسے ہیں کہ وہ تمام کائنات کے لئے ہیں۔ لیکن جو

خودی کی روح ہے وہ صرف مسلم کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی تشریح سمجھ لیجئے تاکہ بات سمجھنے میں آسانی ہو۔ خودی نام ہے انسانیت کی معراج کا اس کے عناصر پر غور فرمالیں۔ زندگی کے مدارج مختلف ہیں۔ ہر درجہ تک پہنچنا اور پہنچنے کے ارادے کا نام نصب العین کا تقرر ہے۔ گویا آپ نے ایک نصب العین قائم کرلیا یہ خودی ہے۔ ہر چیز زندگی کے ساتھ زندہ رہے گی۔ اور ہر زندگی کوششِ پیہم کا نتیجہ ہے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے مسلسل کوششوں کا اُس وقت تک جاری رہنا جب تک کہ نصب العین حاصل نہ ہو جائے زندگی ہے اور یہی سعیٔ پیہم خودی کی زندگی ہے۔ ہم اِس ایک نصب العین کو حاصل کر کے ایک درجہ تک پہنچے ہیں اگر ہم نے اس ایک درجہ پر قناعت کرلی تو ہم نے خودی کا گلا گھونٹ دیا۔ کیونکہ اس کے بعد ہم نے کوئی دوسرا نصب العین تعین نہیں کیا اور بے نصب العین انسان مردہ ہے۔ اگر یکے بعد دیگرے نصب العین تعین کرتے رہے اور ہر نصب العین کے حصول کے لئے سعیٔ پیہم کے تسلسل کی کڑیوں کو جوڑتے چلے گئے تو ہم نے حیاتِ خودی کی حفاظت کی۔ اس پر آپ ضرور کہیں گے کہ اتنا تو ہر انسان کرتا ہی ہے اور کرسکتا ہے پھر مسلم اور غیر مسلم میں کونسی شے باعثِ تخصیص ہوئی؟ سنئے۔ مسلم وہ ہے جو اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرچکا ہو یعنی اپنا سب کچھ مرکز کے پاس بیع کردیا ہو۔ اس کا کچھ نہ رہا ہو سب کچھ اللہ کا ہوچکا ہو۔ اس کی زندگی وحدت کی حفاظت کے لئے ہو اس کی موت خدا کے قوانین کی پاسبانی کے لئے ہو۔ اسکا

ہر نصب العین مرکز کی تمناؤں کے ماتحت ہو اس کی ہر کوشش کا راستہ صراطِ مستقیم ہو اس کا ہر عمل اللہ کی متعین حدود کے اندر ہو۔ ان قیود کا وہی شخص پابند ہو سکتا ہے جو مسلم ہو صاف ظاہر ہے کہ غیر مسلم اپنے سماجی قوانین کا احترام کرے گا۔ اور ان انسانی مترشح دستور کے ماتحت سانس لے گا۔ اس کا ہر نصب العین ذاتی اغراض کا ایک جز ہو گا۔ اس کی ہر کوشش میں دوسروں کا زیاں پوشیدہ ہو گا۔ یہ آفاق میں گم انسان اسی کوشش میں رہے گا۔ کہ میں سب کو کچل کر دوں۔ سب پہ غالب آجاؤں۔ اور "میں" اس مقام وغرور کا ترجمان ہے۔ اور یہی تخیل غیر اسلامی ہے۔ اسی کی بیخ کنی کے لئے اسلام آیا تھا۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ اس کے نصب العین اور حصولِ نصب العین میں مسلم کے نصب العین اور سعیِ پیہم میں کس قدر فرق ہے۔ ان دو مختلف تخیل کی علامہ کے ارشاد سے وضاحت ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

مہر و مہ و مشتری چند نفس کا فروغ!
عشق سے ہے پائیدار تیری خودی کا وجود
تیرے حرم کا خمیر اسود و احمر سے پاک
تنگ ہے تیرے لئے سرخ و سپید و کبود
تیری خودی کا غیاب معرکۂ ذکر و فکر!!
تیری خودی کا حضور عالمِ شعر و سرود

روح اگر ہے تری رنج غلامی سے فرار
تیرے ہنر کا جہاں دیر و طواف و سجود!!

اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو
تیری سپہ انس و جن! تو ہے امیرِ جنود

نظامِ اسلام نے جو حکومت کے ذمہ یہ فرض لگا دیا ہے کہ وہ ایک ایک فرد کی پاسبان ہے اس سے انسان فکرِ معاش سے آزاد ہو جاتا ہے اور صرف اپنے رازق (اللہ) کے آستاں پر جبیں سائی کرتا ہے۔ لیکن انگریز نے اسی انسانی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور نظام اسلام کے خلاف رزق کے ذریعے اپنے قبضے میں لے کر انسان کو فکرِ معاش دے کر غلام بنا لیا

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تیری دیکے تجھے فکرِ معاش!

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے تیرا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

روحِ اسلام کی تابندگی چھیننے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ درسگاہوں سے تعلیم و تربیتِ اسلامی ختم کر دی جائے اور اسکی جگہ انگریزی تمدن کو رواج دیا جائے۔

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں!!
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو!!

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کے تگ و دو!
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

انگریز کی یہ سازش اس طرح پوری ہوئی کہ اس نے مدرسوں کو امداد اور امدادی وظائف دینے شروع کر دیئے۔ بھلا روپے کی کسے ضرورت نہیں ہوتی؟ انگریز نے دانہ ڈالا تھا کہ بڑے بڑے پرہیزگار گر پڑے۔ چنانچہ وہ درسگاہیں جہاں خالص اسلام کی تعلیم اور دینی علوم کی تربیت دی جاتی تھی انہوں نے بھی اس بھیک کے لئے دامن پھیلا دیا اور عرض گذار ہوئے کہ انہیں بھی سایہ رحمت میں جگہ ملے۔ اس طرح انگریز نے تمام اسلامی درسگاہوں کو انگریزی تمدن میں تبدیل کر دیا اور پھر بھی پاسبانِ حرم اسکی تعریف میں قصیدے پڑھنے لگے۔ تو اقبالؒ نے کہا۔

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز!
ہو نہ اخلاص تو دعوئے نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم!!
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

پھر علامہؒ نے اہلِ مشرق کو پکار پکار کر کہا کہ یہ ہنر۔ یہ سیاست۔ یہ علم اور کتابیں اگرچہ موتی ہیں لیکن ان کے انداز اچھے نہیں ہیں اگر ہو سکے تو ان علوم و فنون کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کو بھی قائم رکھو کہ یہی عین حیات ہے

سرودِ شعر سیاست کتاب و دین وہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندہِ خاکی سے ہے نمود ان کی !!!
بلند تر ہے ستاروں سے اُن کا کاشانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی !
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اِن درسگاہوں میں انگریز نے مشین کی تعلیم شروع کی دورِ حاضرہ کے تقاضوں کے ماتحت تعلیم اگرچہ اشد ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انگریز نے ذہن میں یہ بٹھانا شروع کیا کہ ہماری سائنس قانونِ فطرت کے پرچھے اڑا کر بہت آگے بڑھ رہی ہے۔ یہی وہ فساد تھا جس سے اسلام کو خوف تھا اور وہی فساد ان کے ذہن نشیں کر دیا گیا۔ کسی اللہ کے بندے نے قرآن کھول کر نہ سمجھایا کہ یہ دیکھو انگریز کی سائنس کے سرچشمے یہاں بند پڑے ہیں اور قرآن از خود ایک سائنس ہے اس کا علم ستاروں سے اوپر اور سمندروں کے نیچے تک سے آگاہی دیتا ہے ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان علم سائنس سے متاثر ہو گیا دہریہ بن گیا۔ کیونکہ یہ علم

فردوسِ نظر تھا۔

ہے یہ فردوسِ نظر اہلِ ہنر کی تعلیم
فاش ہے چشمِ تماشا پہ نہاں خانہ ذات
نہ خودی ہے نہ جہانِ سحر و شام کے دور
زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات
آہ وہ کافر بیچارہ کہ ہیں اس کے صنم
عصرِ رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات
تو ہے میت۔ یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات

علامہ اقبالؒ نے اس مغربی تعلیم میں صرف جمال کی رعنائیاں محسوس کیں لیکن جلال کا کہیں سراغ نہ ملا۔ جلال تو ملتا ہے غیرت سے شرافت سے اور حفاظتِ خودی کے گہرے احساس سے۔ اس حسن و جمال کو دیکھکر آپ نے فرمایا کہ:۔

میرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیِ ادراک
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

نہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہو تند و سرکش و بیباک

مغربی تمدن نے مرد اور عورت دونوں کے لئے حسن و جمال کی زیبائش کے تمام سامان فراہم کر دیئے۔ اور نت نئی ایجادات سے ان میں اضافہ کرتا چلا گیا اور وہ روحانیت جس کا دوسرا نام اخلاق و شرافت ہے مسلمان کے گھروں سے لوٹ کر لے گیا۔ علامہؒ نے اس تباہی کو دیکھا اور کہا :۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا !!!
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار !!!
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

اسلام نے نہیں کہا کہ علم موسیقی حرام ہے۔ یہی موسیقی تھی جس کی آوازوں نے جنگ کے میدانوں کو لرزہ بر اندام کر دیا تھا۔ اس سے رگوں میں غیرت کا لہو دوڑ جاتا تھا۔ لیکن موسیقی جب انگریز کے تمدن میں بدل کر آئی تو محض ذہنی

عیاشی رہ گئی۔ اور ایسی دھنیں رہ گئیں جن سے لہو سرد ہو اور زندگی کی جدوجہد برف کی سلیں بن جائیں۔ موسیقی پر ہی کیا موقوف ہے۔ ہر وہ آواز جو زندگی کو ٹھنڈا کرنے میں موثر ہو حرام ہے۔

وہ نغمہ سردیِ خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود
وہ نَے نواز کہ جسکا ضمیر پاک نہیں

موسیقی کے ساتھ مغرب نے اپنے تمدن کا حصہ رقصِ بدن بھی مشرق کو عطا کیا۔ انگریز نہایت چالاک اور دانش ہے۔ اس رقص کو پہلے پہل مشرق میں اس نے اپنی مخصوص سوسائٹیوں تک محدود رکھا اور غیر مغربیوں پر پابندی بھی لگادی گئی۔ آہستہ آہستہ پابندی تو اٹھالی لیکن خصوصیت کو ختم نہ کیا۔ پہلے تو مشرق نے صرف تماشائی کی حیثیت سے حصہ لیا اور پھر یہ ذوق اس کے اندر بھی کروٹ لینے لگا۔ اور گوری گوری پنڈلیوں والی برہنہ و نیم برہنہ عورتوں کے ساتھ یہ بھی رقصِ بدن میں شریک ہو گیا۔ پھر اس رقص کو فیشن کا لباس پہنا کر عام سوسائٹی میں لایا گیا۔ اور مردوں کے علاوہ مشرقی خاتون نے بھی حصہ لیا۔ اور اسی تن زیبی کے ساتھ ان محفلوں میں گئی۔ حتےٰ کہ دبا مشرقی آرامگاہوں (ہوٹلوں) میں پہنچا۔ علامہ اقبال رح نے مشرق کو اس خطرہ سے آگاہ کیا۔ اور مشورہ دیا کہ :-

چھوڑ یورپ کے لئے رقصِ بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی!
صلہ اس رقص کا ہے تشنگیِ کام و دہن!!
صلہ اس رقص کا ہے درویشی و شاہنشاہی

ان مدرسوں اور درسگاہوں کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہوا کہ مشرق "ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی" کے مسائل میں الجھ کر رہ گیا۔ مشرق میں دو جماعتیں بن گئیں۔ اور یہ موضوع مستقل بحث کے لئے تجویز کر لیا گیا۔ چنانچہ آج تک اس سانپ کی لکیر کو پیٹا جا رہا ہے اور نہایت نظم و نسق کے ساتھ ہر جماعت اپنے دعوے کے دلائل میں پیش پیش ہے۔ انگریز نے ان نوجوانوں کی.. ذہنیتوں کو ایسے عمدہ انداز سے الجھایا ہے کہ چھٹکارا مشکل ہو گیا ہے۔ تگ و دو کی جانب ان کی توجہ مبذول ہی نہیں ہوتی۔

یہ مدرسہ یہ کھیل یہ غوغائے روا رو!
اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو!!
وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو
نادان۔ ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
اسبابِ ہنر کے لئے لازم ہے تگ و دو

پیامِ نصرت

مکّہ سے نکلتے وقت اُن مہاجرین کے راستے میں تاریک مایوسیاں اور ظلمت انگیز ناامیدیاں تھیں لیکن وہ اِس تاریک ہجوم کو چیرتے ہوئے مدینہ کی جانب چلے گئے۔ دُور افق سے اُس پار ایک بے صوت صدا تھی۔ جو اپنے دلکش انداز میں اِس بے سرو سامان جماعت کے کانوں تک نغمہ روح افزا! پہنچارہی تھی کہ:۔

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے رُوباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشقِ یداللّٰہی!
جو سختیِ منزل کو سامانِ سفر سمجھے!
اے وائے تن آسانی ناپید ہے وہ راہی
وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردکِ میدانی
کہسار کی خلوت ہے تعلیم خود آگاہی!!

جب یہ قافلہ راہ کی سختیوں سے تھک کر ذرا نقاہت محسوس کرتا تو استقلال پکار پکار کر کہتا کہ:۔

فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق!!
پیدا ہو اگر اس کی طبیعت میں حریری

ان کے ارادوں میں استقلال اور ان کی روح میں تازگی آجاتی۔ نگاہ پھر اپنی بے سروسامانی پر جاتی تو وہ دل مسوس کر رہ جاتے۔ وہ ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں مکہ میں چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ انہیں خیال آتا کہ وہ تمام چیزیں از سرِ نو کیونکر فراہم ہوں گی تو عزم کہتا:۔

خوددار نہ ہو فقر تو ہے قہرِ الٰہی
ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہیدِ امیری

کبھی کبھی سفر کی صعوبتوں سے تنگ آکر اُن کا جی چاہا کہ آنحضرتؐ کی خدمت میں شکایت کریں لیکن انسانیت نے یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ:۔

جو فقر ہوا تلخیِ دوراں کا گلہ مند!!!
اُس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی

یہ تمام چیزیں ایک طرف تھیں اور حضور اکرمؐ کا یقینِ محکم ایک طرف تھا انہیں معلوم تھا کہ تمام تاریکیاں کافور ہو جائیں گی۔ انہیں یقین تھا کہ ظلمتوں کے بادل چھٹ جائیں گے۔ اُن کا ایمان تھا کہ پھر ایک روز ہم مکہ کے دروازہ کی کنجی کے مالک بنا دیئے جائیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس ایک صاحبِ یقین کی ہمت نے اس لٹے ہوئے قافلے کو پھر زمین مکہ کا وارث بنا دیا۔

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو!
لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقیں!

فتح خیبر

حدیبیہ سے واپسی پر حضورؐ کو معلوم ہوا کہ یہودی ہم پر حملہ کرنے کے لئے اِدھر اُدھر کے یہود سے ساز باز کر رہے ہیں اب یہ وقت انتظار کا نہ تھا چنانچہ آپ نے خیبر کا رُخ کیا۔ اس وقت آپ کے ہمراہ چودہ سو پیادہ فوج اور دو سو سوار تھے۔ جب آپ خیبر کے سواد میں پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ رات کو حملہ کرنا آپ کی عادت میں نہ تھا۔ اس لئے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ بستی سامنے نظر آ رہی تھی۔ آپ کے سینے میں مومن کا دل تھا جنگ و جدل کے ساتھ ساتھ اللہ سے پناہ اور سلامتی مانگنا مومن ہی کا کام ہے چنانچہ آپ نے اس بستی والوں کے لئے دعا مانگی کہ :-

"اے خدا۔ ہم تجھ سے اس بستی کی اور بستی والوں کی ہر شے کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی شرارتوں سے تجھ سے پناہ کے جویا ہیں۔" (بحوالہ ابن ہشام)

اس وقت اگر آپ چاہتے تو رات کی تاریکیوں میں سوئے ہوئے دشمنوں پر حملہ کر کے آن کی آن میں فتح حاصل کر لیتے لیکن ان کی صالح قوتوں میں تندی و تیزی بر و ناز نہیں تھا بلکہ شرافت تھی۔

. . . .

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں!
جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں!

ابی لہب

رؤسائے قریش میں عتبہ ابوجہل۔ ابوسفیان۔ جیسے سرغنہ موجود تھے جنہوں نے نبی اکرمؐ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا لیکن قرآن نے ان میں سے کسی کو بھی قابلِ ذکر نہیں سمجھا مگر ابی لہب کا خصوصیت سے نام پکارا ہے۔ ابی لہب قریش کا سردار تھا اور اپنے مذہب کا امام بھی تھا۔ اسی لئے وہ دینِ اسلام کا حقیقی دشمن تھا۔ باقی قریش اس کے تابع تھے۔ اِس شخص نے کعبہ کو بتوں کا استھان بنا رکھا تھا۔ یہ بڑا مکار آدمی تھا خزانے میں سے اکثر خورد برد کرتا رہتا تھا۔ نبی اکرمؐ کی دعوتِ توحید میں اِسے اپنے منصب کے چھن جانے کا اندیشہ رہتا تھا۔ اور یہ بھی کہ اسلام میں داخل ہو کر دولت کے سرچشمے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ یہ ہوس اِسے توحید پرستی سے روک رہا تھا۔

سہ
خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!

قریش کے تمام رؤسا اس کے قبضے میں تھے گویا ان کی ساری قوتیں اس کی اطاعت گذار تھیں۔ لیکن مسلمانوں میں سے ایک بھی تو ایسا نہ تھا جو اس کی

طاقت سے ارادوں میں لچک آجائے۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کسطرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

جنگِ بدر میں قریش کے تمام چھوٹے بڑے میدانِ جنگ میں نکل آئے تھے۔ مگر ابی لہب مال و دولت کی حفاظت میں باہر نہیں نکلا تھا بلکہ اس نے عاصی بن ہشام سے چار ہزار درم قرضہ میں لینے تھے چنانچہ عاصی کی جان خرید کر اُسے اپنی جگہ میدانِ جنگ میں بھیج دیا تھا۔ ایسا نکما اور بزدل آدمی کعبہ جیسے افضل و مقدس مقام کا کب تک مالک بنا رہتا؟ ایسے شخص کے بے دست و پا ہو جانے کی پیشگوئی کا صاف مقصد یہ تھا کہ کعبہ کی تولیت ایسے ہاتھوں میں آجائے جو اسے ذاتی اغراض کے حصول کا ذریعہ نہ بنائے۔ اور وہ ہاتھ تھے رسولؐ کے ہاتھ جن کی ذاتِ اطہر کے متعلق علامہؒ فرماتے ہیں کہ:۔

وہ دانائے سبُل ختم الرسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا!!!

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

ابی لہب صرف موت کے ڈر سے اور جان کے بچاؤ کے خیال سے میدانِ بدر میں شریک نہ ہوا۔ لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ میدان کے ساتویں روز

اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے چیچک کے عارضہ سے مر گیا اس وقت اس کے دونوں بیٹے موجود تھے لیکن بیماری کے خطرہ کی وجہ سے اس کی لاش تک نہ آئے۔ اور کئی گھنٹوں تک لاش یونہی پڑی رہی آخر لوگوں کی شرم سے لاش کو شہر سے دور لیجا کر پھینک دیا گیا اور دور سے پتھراؤ کر کے پتھروں کے ڈھیر میں چھپا دیا۔ یہ تھا وہ ابی لہب جس نے شکم کے لئے جائز و ناجائز طریقوں سے سامان فراہم کر رکھے تھے۔ ع

دل کی آزادی شہنشاہی۔ شکم سامانِ موت

لیکن کیا آج اس زمانے میں اور اپنی ہی ملت میں ابی لہب موجود نہیں ہیں؟ تلاش کیجئے تو ہر قبیلے میں ملیں گے۔

اُسی طلسم کہن میں اسیر ہے آدم!!
بغل میں اس کی اب تک بتانِ عہد عتیق

ابی لہب کی موت اور ذلت نے واضح کر دیا کہ تمام سرمایہ جو مرکز سے چھپا کر ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر خزانوں میں دفن کر لیا جائے از خود سامان موت ہے۔ اور اس بُت کی پرستش سے آزادیِ قلب حاصل نہیں ہوتی۔ اسی حقیقت سے مردِ قلندر نے روشناس کیا ہے اور فرمایا کہ:۔

عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف!!!

ابی لہب کی لاش پکار پکار کر زمانے کو سنا رہی تھی کہ :۔

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق!
عشق ہے مرگِ باشرف مرگ حیاتِ بے شرف

یہ حال تو اس کا دنیا میں ہوا اور زمانے نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا لیکن قدرت نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ
(وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑے گا)

آدمی جو وہاں سے آتا ہے
اپنے انگار ساتھ لاتا ہے

اس دولت، سرمایہ اور ہوس کو جو انسانیت کے خلاف طریقوں سے حاصل کر کے ذاتی اغراض کے لیے جمع کی ہو۔ علامہؒ نے خس و خاشاک کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ انبار منزل کی راہ میں رکاوٹیں ہیں جب تک انہیں جلا کر راکھ نہ کر دیا جائے۔ راستہ صاف نہیں ہوتا۔ ؎

یہ دہر کہن کیا ہے انبارِ خس و خاشاک!
مشکل ہے گذر اس میں بے نالۂ آتشناک

چھ برس کے بعد ۸ھ میں مکہ سے باہر پھر خدا کے لشکر نے ڈیرے لگا دیئے ابوسفیان اس لشکر کی تحقیق کے لئے خفیہ طور پر آیا اور گرفتار ہو گیا۔ اسے گرفتاری کی حالت میں حضورِ اکرمؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ایک مسلمان نے ابوسفیان

سے مخاطب ہو کر کہا

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

اس نے حضورؐ سے کہا کہ یہ گرفتاری میری حاضری کا اک بہانہ بن گئی ہے وگرنہ میرے دل میں تھا کہ قریش کی دولت کے بھیانک جال سے آزاد ہو کر یہاں آجاؤں۔

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھ لیا۔ اس پر ایک مسلمان نے مسکرا کر کہا۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

اب ابوسفیان اس قدر ذی عزت اور قابلِ اعتماد تھا کہ اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا دروازے بند کر لے گا یا ابوسفیان کے گھر پناہ لے گا اسے امن دیدیا جائے گا

"اے پیغمبر اسلام۔ آپ اعلان کر دیجئے کہ دیکھو حق ظاہر ہو گیا اور باطل نابود ہوا۔ اور باطل اسی لئے تھا کہ نابود ہو کر رہے۔"

اس اعلان کے بعد حضورِ اکرمؐ بغیر جنگ کئے مکہ میں داخل ہو گئے۔ یہ جذبہ

خودی کا ترجمان ہی تو تھا جس نے تمام راستے ہموار کر دیئے۔

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

وہی بے کس و بے بس انسان جو آٹھ سال پہلے اسی مکہ سے رات کو جان بچا کر نکلا تھا۔ کسی غیر کی مدد لئے بغیر آج اس جاہ و حشمت سے اسی مکہ میں داخل ہوا جو آج تک کسی شہنشاہ کو نصیب نہ ہوئی۔ اللہ کے فرشتوں نے اس "انسان" پر درود بھیجا۔

"بلا شبہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی اکرمؐ پر درود و سلام بھیج رہے ہیں اے پیروانِ دعوتِ ایمانی (تم بھی اپنے خدا کے ساتھ) اُن پر درود و سلام بھیجو" ($\frac{۳۳}{۵۶}$)

خدا کے حضور اس شانِ خسروانہ اور اندازِ گدایانہ سے دلوں کو جھکاتے ہوئے سروں کو بلند کئے کعبہ کی طرف تشریف لائے۔ کعبہ ایک بہت بڑا بتکدہ بن رہا تھا۔ سب سے پہلے اسے اس آلودگی سے پاک کیا۔ حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی۔ اور یوں قریب اڑھائی سال بعد اللہ کے گھر سے اللہ کا نام بلند ہوا۔ کعبہ کے اندر جا کر آپ بحضور رب العزت سجدہ ریز ہوئے۔ اس کے بعد لوگوں کو جمع کر کے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ حکومتِ الٰہیہ کا پہلا خطبہ سلطنت تھا۔

خدا کے پاک بندوں نے تخیلات کی رعنائیوں سے کام نہیں لیا بلکہ بے دھڑک اللہ کا پیغام عام کیا اور کہہ دیا کہ جہالت کا غرورِ باطل اور نسب کا افتخار سب خدا نے مٹا دیئے ہیں۔

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناں گوں

قابلِ ہزار حمد و ستائش ہے وہ بارگاہِ صمدیت جس نے اپنے ان وعدوں کو پورا کیا جو اُس وقت کیئے گئے تھے۔ جبکہ ساری فضا نامساعد اور حالات بالکل ناسازگار تھے۔ چاروں طرف تاریک مایوسیاں تھیں۔ اُس نے اپنے بندے کی تائید و نصرت فرمائی اور تمام طاغوتی قوتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ لیکن یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے عملِ پیہم سے انسانیت کا مقامِ معراج حاصل کیا اور ساری فضا پر غالب آ گئے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

طاؤس و ربابِ آخر

حضور نے خطبہ کے بعد جب مجمع پر نگاہ ڈالی تو سامنے تمام متکبرین قریش کھڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے اُس دن دعوتِ حق و صداقت کی

تحقیر کی تھی۔ جب حضورؐ نے صفا کی پہاڑی سے اللہ کا نام ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ جنہوں نے خاندانِ ہاشم کو تین برس تک ایک پہاڑی کے غار میں محصور رکھا تھا۔ اور معصوم بچوں کی تشنگی کا بھی احساس نہیں کیا تھا۔ جنہوں نے سازش کی تھی کہ شب ہجرت سب مل کر اس اللہ کے لشکر کو (معاذ اللہ) ختم کر دیا جائے۔ جنہوں نے بدر کے مقام میں اپنی تمام قوتوں کو اس لئے جمع کیا تھا کہ اس مٹھی بھر جماعت کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ جنہوں نے اُحد کے میدان میں حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا تھا۔

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے حضورؐ کو بھی زخمی کر دیا تھا۔ اور وہ عورت ہندہ بھی سامنے کھڑی تھی جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا لیا تھا اور اپنی قومی بربریت اور درندگی کی مثال پیش کی تھی۔ ان انسانوں کے گروہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ کہ یہ بھی اُسی آدم کی اولاد ہیں جس کے حضور میں فرشتوں نے سجدہ کیا؟

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا

نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شاہکار ہے تیرے ہنر کا؟

کیا اس وقت کوئی قانون اور کوئی طاقت مجرمین کے قتل سے باز رکھ سکتی تھی؟ اسوقت وہ دشمنانِ حق و صداقت مسلمانوں کے رحم و کرم پر تھے حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ تو ان لوگوں نے وہ جملہ دہرایا جو اس سے پیشتر کئی بار دہرا چکے تھے انہوں نے کہا کہ یہ تو ہم نہیں جانتے البتہ "تو شریف ہے، شریف زادہ ہے۔ تیری نگاہوں میں اور سینے میں شرافت ہے"۔

نبی کی سیرت یہی ہے کہ وہ ہر مقام پر شرافت کا مجسمہ ثابت ہو۔ اس وقت حضورؐ میں انتقام کی پوری پوری قوت موجود تھی۔ سامان موجود تھے۔ موقع ہاتھ میں تھا۔ گنہگار گرفت میں تھے۔ اور پچھلی زندگی آنکھوں کے سامنے تھی لیکن شرافت کے مجسمے نے کہا۔

"آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو"۔ عرب مسلمانوں کی رگوں میں شرافت کا خون دوڑ گیا۔ اور ایک ایک مسلمان نے ایک ایک قریش کو معاف کر دیا۔ آج انہوں نے محسوس کیا کہ حقیقی معنوں میں وہ فاتح ہیں۔ زمین اور ملک کو فتح کرنے سے فاتح نہیں بنا جاتا جب تک کہ انسانی کمزوریوں پر فتح حاصل نہ کی جائے۔ وہ آج بہت خوش تھے۔ اور یہ خوشی

برسوں کی تکالیف کے بعد میسر ہوئی تھی۔ انہوں نے خوشی کے شادیانے بجائے۔ اور یہ ان کا عملِ ثانی تھا عملِ اول تو شمشیر و سناں رہا ہے۔ ایک مجاہد کے لئے لازم بھی یہی ہے۔ اسی عمل سے وہ اپنی تقدیر کے مالک بنتے ہیں۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

کلیدِ کعبہ

دورِ قریش میں عثمان ابنِ طلحہ شیبس ایک شخص تھا کلیدِ کعبہ اسی کے پاس تھی ہجرت کے وقت حضورؐ اس کے پاس آئے اور کہا کہ "ذرا کعبہ کا دروازہ کھول دو۔ تو جانے سے پہلے اس کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو تسکین دے لوں" اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے کہا "آج تم میری خاطر دروازہ کھولنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ تم مختار ہو۔ لیکن وہ وقت بھی آنے والا ہے۔ کہ یہی کلید میں جس کے ہاتھ میں دیدوں گا قیامت تک اس سے کوئی نہ چھین سکے گا" اور یہ کہہ کر آپ خاموشی سے تشریف لے گئے۔ آپ کی پیش گوئی کا ایک ایک لفظ قابلِ غور ہے۔ اس ایک جملہ میں کس قدر اعتماد و یقینِ محکم کی جھلک ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ :-

خودی وہ بحر ہے جسکا کوئی کنارا نہیں!
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں!
خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں!
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں!!

اللہ تعالےٰ کا ایک ایک وعدہ سچا ہوا اور اللہ نے اپنے پاک بندے حضور اکرمؐ کے الفاظ کا پورا پورا احترام کیا۔ وہی عثمان آج بے دست و پا سامنے کھڑا تھا اور وہی کلید آنحضرت کے ہاتھ میں تھی۔ آپؐ نے پوچھا اے عثمان تمہیں وہ واقعہ یاد ہے جب ہم اس کلید کو ترس رہے تھے اور وہ تمہارے قبضے میں تھی اور میں نے کہا تھا کہ یہ دن آکر رہے گا۔ عثمان آپ کی گفتگو سُن رہا تھا اور پیشانی سے عرقِ انفعال کے قطرے گر رہے تھے اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ آج کے دربار میں وہی فقیرِ گلیم پوش آنحضرت صلعم پادشاہ تھے۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی!
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تیری زندگی اسی سے تیری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو رُوسیاہی

حضورؐ کلیدِ کعبہ کو لے کر آگے بڑھے سب کی نگاہیں منتظر تھیں کہ یہ امانت کس امینِ اعظم کے سپرد کی جاتی ہے۔ حضورؐ اور آگے بڑھے اور وہ کلید اسی

عثمان کے ہاتھ میں دیدی۔ فضا اللہ اکبر سے گونج اٹھی۔ یہ تھی نوازش شاہنشانہ اور ترحم خسروانہ۔ اس اندازِ بے نیازی سے عثمان کی آنکھیں کھل گئیں۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

ایمان و قوت

جب مکہ فتح ہو گیا تو اس کی مرکزیت سے مغلوب ہو کر مختلف قبیلوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اب انہوں نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ یہ وہی لوگ تھے جو کل تک اللہ اور اللہ کے نام کے سخت دشمن تھے اور آج اسلامی برادری میں بصد فخر شمولیت کا اظہار کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ کیا چیز تھی کہ مسلمانوں کو خدائی مل رہی تھی۔! یہ تھا ایمان۔ یہ تھا اپنے آپ پر بھروسہ اور اللہ پر تقویٰ۔

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاحِ کار کی راہ

اکثر حضرات سوال کرتے ہیں کہ عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ آج بھی مسلمان عبادت گو ہیں۔ آج بھی عابد و پرہیزگار موجود ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ بالخصوص یہی لوگ تباہ حال ہیں۔ عبادت از خود تو پھر کوئی شے نہ ہوئی کیونکہ

اس سے نہ تو سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے نہ اطمینانِ دماغ۔ پھر یہ کس لئے ہے؟ اور اگر یہ واقعی دکھوں کا مداوا ہے تو پھر صحیح طریق اور عبادت کیا ہے؟ جسے اختیار کر کے مصائب سے نجات مل سکے۔

یہ سوال تو دو چار باتوں میں ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کا جواب تیرہ سو سال کی پوری تاریخ ہے۔

جب مسلمان نے آخرت سے مفہوم موت کے بعد کی زندگی سمجھا اور دنیا کو ذاتی اغراض تک محدود رکھا تو اس کی نظر سے دونوں مقام اوجھل ہو گئے اور اسی مقام سے زوال کی منزل شروع ہوئی۔ دراصل دنیا سے مراد فعل حال ہے اور اسے بہتر بنانے سے مقصود یہ ہے کہ اپنی مرکزی قوت دورِ حاضرہ کے تقاضوں کے ماتحت نہایت قوی اور پائیدار بنائی جائے اور ہر مسلمان اس مرکز کے دائرہ میں آجائے ـــــ آخرت سے مراد زمانہ مستقبل ہے کہ اس طریق اور انداز سے کام کئے جائیں کہ مستقبل میں ان کا ثمرہ بہتر سے بہتر مل سکے اور ہمارے بعد ہماری نسلیں ہمارے مستقبل کو اپنا عمدہ حال پا کر سرفرازی کی زندگی میں داخل ہوں اور یہ سلسلہ جاری وساری رہے حتےٰ کہ ہر نسل اپنا مستقبل خوشگوار بنائے تاکہ مستقبل میں آنے والی نسل کے لئے عمدہ حال تیار رہے۔ لیکن ہمارے مذہبی طبقے نے سلاطین کے عہد میں عوام کو ایسی تاویلات میں الجھا دیا کہ ہماری قوم دین سے بالکل الگ ہو کر رہ گئی جس کا نتیجہ لازمی طور پر تباہی تھا۔

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیِ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

ہم وہی انسان ہیں۔ وہی بزرگوں کی اولاد ہیں جو اِس زمین کے وارث تھے۔ وہی عبادت ہے۔ وہی نماز ہے لیکن وہ عروج نہیں ہے بلکہ عروج کے بدلے ذلّت ہے۔

گراں بہا ہے تو فقط خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

اب سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر عروجِ نعمت و جاہ کا معیار اسلامی زندگی اور قرآنی نظام ہی ہے تو پھر غیر اسلامی قومیں کس بنا پر عروج پذیر ہیں؟ اِس کے جواب میں میں عرض کروں گا کہ ایک بازار کی رنڈی کے پاس بے شمار دولت ہوتی ہے اور اُس کے مقابلہ میں ایک شریف گھرانے کے پاس بہت تھوڑی دولت ہوتی ہے۔ یہ کیوں؟ حالانکہ یہ شریف گھرانہ اللہ کے پاک بندوں کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔ جواب آپ کو آپ ہی کے سوال سے مل رہا ہے۔ ذرا غور فرمائیے تو اِس کی تہہ میں سے حقیقت ابھر کر نظر آ رہی ہے۔ اور لفظ "ذریعہ" پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ ساری رونق میرے دم خم سے ہے۔ نیک ذریعوں سے حاصل کردہ دولت بے شمار نہیں ہو سکتی۔

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن!
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے؟

جب بہت سے قبیلے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تو قبیلہ ہوازن اور ثقیف کی آتشِ حسد اور عداوت بھڑک اٹھی وہ اسلامی عروج کو برداشت نہ کر سکے چنانچہ انہوں نے جنگ کی ٹھان لی۔ ادھر حضورؐ کو معلوم ہوا۔ تو آپ بھی لشکر کو لے کر آگے بڑھے۔ مکہ اور طائف کے درمیان حُنین کی وادی میں دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ اس سے پہلی جنگوں میں مسلمان تعداد میں کم ہوتے تھے اور اُن کے پاس سامانِ جنگ بھی کم ہوتا تھا۔ اس مرتبہ ان کے پاس بارہ ہزار کی مسلح فوج تھی اور ہر قسم کے ہتھیار بھی تھے۔ پہلے کی طرح انہوں نے تائیدِ خداوندی پر بھروسہ نہ کیا بلکہ قوتِ بازو پر اعتماد کیا اور انہیں گھمنڈ ہو گیا کہ وہ مادی قوتوں کے بل بوتے پر حریف کو پیس کر رکھ دیں گے۔ یہ غرور اللہ کے قانون کو پسند نہیں ہے کہ انسان اپنے رب کو بھلا کر مادہ قوتوں پر اعتماد کر کے آگے بڑھے اور شرک میں پڑ جائے۔

بے ذوقِ نمودِ زندگی موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی!

رائی زورِ خودی سے پربت
پربت ضعفِ خودی سے رائی

ہوا یہ کہ پہلے ہی حملہ میں ایسی شکست کھائی کہ بارہ ہزار کا لشکر تتر بتر ہو گیا

چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی دشمن سیلاب کی طرح بپھرا ہوا تھا اور مسلمان بھاگ رہے تھے۔ ع

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں!

وہ تخیل جس نے بڑے زعم سے للکارا تھا کہ آج ہم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ آج ہم طاقتور ہیں۔ آج ہمیں کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے آج ہم قوتِ بازو سے میدان حاصل کریں گے۔ محوِ حیرت و استعجاب تھا اور عقل ششدر و حیران تھی کہ اس ذلت کا باعث کیا ہے؟ اس وقت دل کے گوشوں نے کہا۔

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانا کردارِ قاہرانہ !!!!

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

اس خلفشار میں ایک پیکرِ استقامت تھا جو روشنی کے مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑا تھا۔ اور وہ ذاتِ گرامی خود رسول اللہؐ کی ذات تھی جنہیں اپنے دعوۂ صداقت اور نصرتِ خداوندی پر یقین کامل تھا۔ آپ نے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو پکارا۔ خدا جانے اس آواز میں کونسی قوت تھی کہ بھاگتے ہوؤں کے

قدم جم گئے۔ اور لبیک کہا حضورؐ نے اپنوں اور غیروں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں خدا کا پیغبر ہوں اس میں کچھ جھوٹ نہیں۔ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ باطل ہم پر غالب آ جائے۔ ہم انشاء اللہ باطل پر غالب آئیں گے کہ زمین کی وراثت ہمارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ میں یہاں خدا کا ٹھہرایا ہوا ہوں۔ اور اُس وقت تک ٹھہرا رہوں گا جب تک فتح نہ کر لوں۔ پھر آپ نے مسلمانوں کو واپس بلایا چند لمحوں میں پوری کی پوری فوج دوبارہ اس مرکزِ حق و صداقت کے گرد جمع ہو گئی۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے!
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اللہ نے اس واقعہ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ۔

"(مسلمانوں) یہ واقعہ ہے کہ اللہ بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کر چکا ہے جبکہ تمہیں اپنی قلت و کمزوری سے کامیابی کی امید نہ تھی۔ اور جنگِ حنین کے موقعہ پر بھی جبکہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے (اور سمجھتے تھے کہ محض اپنی کثرت سے میدان مار لو گے) تو دیکھو وہ کثرت تمہارے لئے کچھ کام نہ آئی۔ اور زمین اپنی ساری وسعت پر بھی تمہارے لئے تنگ ہو گئی۔ بالآخر ایسا ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے"۔ ($\frac{9}{25}$)

اس کے بعد نہایت ہی محکم یقین کے ساتھ اللہ کی امداد کو پکارتے ہوئے آنحضرتؐ نے اپنے لشکر کو حملہ کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے اللہ کا نام بلند کرتے ہوئے

حملہ کر دیا۔ اور حملہ کے ساتھ ہی دشمن اِس طرح میدان چھوڑ کر بھاگے جیسے وہ پہلے سے ارادہ کر چکے ہوں۔ اللہ نے اِس فتح کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ :۔

"پھر اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کا سکون اور قرار نازل فرمایا۔ اور ایسی فوجیں اتار دیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور اسطرح اُن لوگوں کو عذاب دیا جنہوں نے انکار کی راہ اختیار کی تھی اور ایسی سزا ہے اُن لوگوں کی جو انکار (کفر) کی راہ اختیار کرتے ہیں (یعنی اُن کی بدعملی کا لازمی نتیجہ یہی ہے)"۔ $\frac{9}{26}$

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جاکر جمع ہو گئی۔ حضورؐ نے جاکر شہر کا محاصرہ کیا۔ بیس دن تک محاصرہ رہا۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا زور ٹوٹ گیا ہے۔ تو محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

عقل کے تمام فیصلے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ عقل نے کثرت دیکھکر غلبہ کا اعلان کیا اور جھوٹ رہا۔ پھر عقل نے شکست کے بعد حملہ کا تمسخر اڑایا اور فتح مندی نے اسکا منہ توڑ جواب دیا۔ اِس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ جب تک فطرت کی نگہبانی نہیں کرتا اس کی نگہبانی نہیں ہوتی۔

فطرت کو خرد کے رُوبرو کر — تسخیرِ مقامِ رنگ و بُو کر
تُو اپنی خودی کو کھو چکا ہے — کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر

اعجازِ عشق

اس لڑائی میں بہت زیادہ مقدار میں زرو مال ہاتھ آیا تھا۔ حضورؐ کی حیثیت امیرِ ملت کی تھی۔ آپ کو تقسیمِ غنیمت کے کلُ اختیارات تھے۔ آپ نے تقسیم میں یہ رعایت رکھی قریش مکہ میں جو لوگ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے۔ انکی دلجوئی کی خاطر انہیں زیادہ حصہ دیا گیا۔ اس رعایت سے انصار کے دلوں میں ولولہ پیدا ہوا۔ حضورؐ ایک نگاہ سے ان کے دل کی گہرائیوں کو بھانپ گئے حضورؐ چاہتے تو ایک لفظ سے ان کی زبانیں روک دیتے۔ لیکن اسلام تو امریت کی مطلق تعلیم نہیں دیتا۔ حضورؐ نے انہیں جمع کیا اور خطبہ فرمایا کہ:۔

"اے انصار! یہ سب سچ ہے۔ لیکن کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ یہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں۔ اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لیجاؤ؟

یہ سنکر مجمع کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ اور ایک ایک نے عشقِ محمدؐ میں ڈوب کر کہا۔ "یا رسُول اللہ! آپ سب کچھ انہیں دے دیجئے۔ ہمیں صرف محمدؐ درکار ہے۔"

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

جو لوگ حضرت کے ان اشاروں کو بھی نہ سمجھے اُن کے لئے علامہؒ نے

کہا ہے کہ :۔

نظر نہیں تو میرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ !
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

اس واقعہ حنین سے ہمیں اسقدر سبق ملتا ہے کہ ہم نظر تحقیق سے مطالعہ کریں تو اس ایک واقعہ میں ساری زندگی سمٹی ہوئی نظر آئے گی۔ اللہ کے وہ اٹل فیصلے سطح پر ابھرے ہوئے نظر آئیں گے کہ مادی قوتیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔ جب تک قوموں میں جمعیتِ خاطر کا جوہر موجود نہ ہو۔ کسی سلطنت کے قیام یا بقا کے لیئے اگرچہ قوتیں ضروری ہیں لیکن جب تک سینوں میں ایمان کی لافانی قوت نہ ہو گی یہ باقی تمام قوتیں بیکار ثابت ہوں گی۔ جرمنی کے فرعون (ہٹلر) کی بے پناہ طاقتوں کی شکستِ فاش نے فطرت کی اس حقیقت پر مہر ثبت کر دی ہے۔ ایمان اور قوت کے ساتھ قربانی کا جوہر بھی بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ قربانی ایثار کا نام ہے اور ایثار میں ایثارِ مال وجان دونوں شامل ہیں۔ کیونکہ ہوس کے فولاد کو یہی تیزاب پگھلا سکتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ جذبہ کہ جنگ صرف حفاظت دین کے لیئے حلال ہے اور اس جنگ میں فتح کے بغیر واپس ہونا کفر ہے۔ یہ تمام چیزیں یکجا کر دیں تو اسکا دوسرا نام داستانِ حرم ہو گا۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ۔ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

اسیرِ گردش

مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت دیکھکر رومی حکومت کو خیال ہوا کہ اِس سیلاب کو پہلے ہی سے روک دینا چاہیئے۔ چنانچہ اپنے ماتحت شام کی حکومت کو اِس کے لیئے متعین کیا۔ اور بہت بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاریاں شروع ہوئیں یہ واقعہ غزوہِ تبوک کے نام سے مشہور ہے۔ جو ۹ھ میں ہوا۔

ادھر مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ غریبی کے علاوہ قحط کا دور بھی گذر رہا تھا لیکن اصحابِ کرامؓ اور سچے مسلمانوں نے حسبِ توفیق سب کچھ جنگ کے لیئے پیش کر دیا مگر ان مسلمانوں میں کچھ منافق لوگ بھی تھے۔ وُہ اِس جنگ سے کترانے لگے۔ کچھ جنگ میں شامِل ہی نہ ہوئے اور کچھ میدان سے واپس چلے آئے۔ اُن کی زبان پر گردشِ شام وسحر کی شکایتیں تھیں۔ یہ کہہ رہے تھے کہ ہم اچھے مسلمان ہوئے کہ زندگی جنگوں میں گذر رہی ہے۔

ایسے نازک وقت میں جبکہ ساری ملت کی موت وحیات کا سوال درپیش ہو۔ وہی پیچھے رہنے کی اجازت مانگ سکتا ہے جس کے ایمان میں خلل ہو۔

"(اے پیغمبرِ اسلام) تجھ سے اجازت طلب کرنے والے تو وہی ہیں جو فی الحقیقت اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور ان کے دل شک میں پڑ گئے ہیں۔ اور اپنے شک کی حالت میں متردد ہو رہے

ہیں ۔ ۵ $\frac{9}{45}$

حضرت علامہؒ نے اس کی تفسیر یوں فرما دی ہے ۔

اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر
گردشِ دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلا !

حجتِ بیجا

یہ ٹھیک ہے کہ بعض صورتیں معذوری کی بھی ہوتی ہیں ۔ ایسی حالت میں کسی پر الزام نہیں لگایا جاتا ۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ :-

" ناتوانوں پر ۔ بیماروں پر ۔ اور ایسے لوگوں پر جنہیں خرچ کے لئے کچھ میسر نہیں ۔ کچھ گناہ نہیں اگر وہ دفاع میں شریک نہ ہوں ۔ بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی میں کوشاں رہیں کیونکہ ایسے لوگ نیک عملی کے دائرے سے الگ نہیں ہوتے اور نیک عملوں پر الزام کی کوئی وجہ نہیں ۔ اللہ بڑا ہی بخشنے والا ہے اور رحمت والا ہے " ۵ $\left(\frac{9}{91}\right)$

لیکن ایسے لوگ جو ہر طرح سے دفاع میں شرکت کے قابل ہوں اور پھر بہانہ تراشیاں کریں انہیں کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا ۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ :-

" (اے پیغمبرِ اسلام) الزام تو ان پر ہے جو تجھ سے بیٹھے رہنے کی اجازت مانگتے ہیں حالانکہ مالدار ہیں ۔ انہوں نے پسند کیا کہ جب سب لوگ راہ حق

ہیں کوچ کر رہے ہوں تو یہ گھروں میں رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ رہیں اللہ نے انکے دلوں پر مہر لگا دی۔ پس یہ سمجھتے بوجھتے نہیں" (۹/۹۳)

اللہ کے آخری جملے کے ٹکڑے (سمجھتے بوجھتے نہیں) کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگ اس حقیقت پر ایمان ویقین نہیں رکھتے کہ زندگی اور موت پر صرف اللہ کو قدرت حاصل ہے وہ چاہے تو حضرت ابراہیمؑ کو نمرود کی آگ میں سلامت رکھے اور چاہے تو آرام سے بیٹھے بٹھائے کی روح قبض کرلے۔ پھر یہ بھی نہیں سمجھتے کہ پیغمبر اسلام کا عمل ہی زندگی کا مقصود ہے اور یہی معراجِ انسانیت ہے۔ اور یہ بھی نہیں سمجھتے کہ اسی بلندیٔ شرافت سے کبریائی حاصل ہوتی ہے اور اپنی اسی بلندی سے انسان ساری فضا پر کمند ڈال کر اسے تسخیر کر لیتا ہے حضرت علامہؒ نے اس حقیقتِ کبریٰ کو ایک شعر میں بیان فرما دیا ہے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی

زمین و آسمان و کرسی و عرش!
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

کشاں کشاں

ہماری دینی تعلیم یہ ہے کہ ہم جب امن کی زندگی بسر کر رہے ہوں تو جہاد

کا سامان تیار کرتے رہیں اور جب جہاد میں ہوں تو امنِ عالم کے لئے لڑتے رہیں اور اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک لڑائی کا فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہو جائے ایسے مجاہدین کے لئے اللہ نے حال ماضی اور مستقبل میں نعمتوں کا وعدہ کیا ہے۔

"اور مہاجرین وانصار میں سے جو لوگ سبقت کرنے والے سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی تو اللہ ان سے خوشنود ہوا۔ وہ اللہ سے خوشنود ہوئے۔ اور اللہ نے اُن کے لئے باغ تیار کئے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ (اور اِس لئے وہ خشک ہونے والے نہیں) وہ ہمیشہ اس نعمت کی زندگی میں رہیں گے۔ اور یہ سب بڑی نعمت ہے۔" ($\frac{9}{100}$)

اسلام نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ اپنے مرکز میں رہ کر مرکز سے بیرونی حالات کا بھی جائزہ لیتے رہو۔ لیکن بیرونی حالات کے ساتھ نہ جا ملو بلکہ رہو مرکز میں ہی۔ اور مرکزیت کی قوت سے خارجی اور داخلی چیزوں پر غالب آجاؤ۔ ؎

خودی کے نور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا

برنگِ بحرِ ساحل آشنا رہ
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

آخر زمانی

ہمارے دور کا مسلمان زوالِ امت کے اسباب پوچھتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ اسباب کیا ہیں؟ ان میں سے اکثریت کے ساتھ ایسے ہیں جن کا فیصلہ ہے کہ زوال صرف غریبی اور افلاس سے آیا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ جنگِ تبوک میں مسلمانوں کے پاس سواری کا انتظام بھی نہیں تھا اور وہ اِس افلاس کے ساتھ میدان میں کود پڑے تھے اور مقابل کے بے شمار سامان پر غالب آ گئے تھے ان لوگوں سے اگر کہا جائے کہ اٹھو خدا کی راہ میں قدم اٹھاؤ۔ اپنا مقام پہچانو۔ تو جواب دیتے ہیں کہ یہ عزت اور ذلت سب خدا کی طرف سے ہے اگر ہماری تقدیر میں ذلت ہے تو اُسوقت تک مسلط رہے گی جب تک خدا اسے ختم نہ کر دے۔ لیکن اقبالؒ فرماتے ہیں کہ:۔

تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

اور یہ کہتے ہیں کہ تقدیر بدلنے والا تو امام مہدی ہے جب تک ان کا ظہور نہیں ہوتا ذہنی تبدیلی ناممکن ہے وہ آخر زمانی آئے گا اور ایسا چھو منتر پڑھے گا کہ باطل کی چنگاریاں اڑتی نظر آئیں گی کفر مغلوب ہو جائے گا۔ اور پھر ہم اس سے پہلے کیوں حرکت میں آئیں؟ لیکن اقبالؒ کہتے ہیں کہ ہر وہ مسلم جو پہلے مومن کی صفات لے کر میدان میں آجائے وہی آخر زمانی ہے۔

کھلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی
گیا دورِ حدیثِ لن ترانی!

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی!

وفاشعاری

مرکز سے دوستی رکھنے کا نام ملّت سے وفاشعاری کرنا ہے جنگ تبوک میں کچھ لوگ گھروں میں رہ گئے تھے ان میں سے ایک کعب بن مالک رضؓ بھی تھے۔ لیکن یہ دانستہ نہیں رہ گئے تھے بلکہ اِن سے سستی واقعہ ہوئی تھی۔ جب آنحضرتؐ فتح کے بعد واپس تشریف لائے تو ان منافقین کا معاملہ درپیش ہوا۔ کچھ لوگوں نے عذرت پیش کی اور گناہ معاف بھی کروالیا۔ لوگوں نے کعب سے کہا کہ تم بھی جاکر معاف کروالو تو انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ کے روبرو غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا چنانچہ کعب نے جاکر صحیح بات عرض کردی تو حضورؐ نے فرمایا کہ خدا کے حکم کا انتظار کرو اور باقی تمام کو حکم دیا کہ اِس شخص سے مکمل بائیکاٹ کردیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا ایک روز ایک شامی سوداگر نے ملک غسان کا خط لاکر دیا جس میں لکھا تھا کہ اگر تمہارے آقا نے تمہارا بائیکاٹ کردیا ہے تو تم ہمارے پاس چلے آؤ۔ یہاں تمہارے لئے عزت کے سامان موجود ہیں۔ اب آپ غور کیجئے کہ کعب کے پاس اِس خط کا کیا

جواب تھا؟ کعب کی مشکلات کا تقاضہ تھا کہ وہ اُسی وقت عزت کی جگہ پہنچ جاتا لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے وہ خط اُسی قاصد کے سامنے جلا دیا اور کہا کہ اپنے آقا سے جاکر کہہ دینا کہ مجھے میرے آقا کی ناراضگی مبارک ہے ایسا آقا جس کا خود خدا لحاظ کرتا ہے۔ ——————— اور آج کیا ہو رہا ہے؟ آپ کو معلوم ہوگا کہ فیصلہ پاکستان کے بعد گنتی کے چند مسلمانوں نے حضرت قائدِ اعظمؒ کے ساتھ ہجرت کا فیصلہ کیا تھا۔ باقی سب نے فقرے کسے اور مذاق اڑایا تھا اور یہاں تک کہا تھا کہ اس بڈھے کے حواس ٹھیک نہیں ہیں۔ یہ پاکستان کا خواب دیکھ رہا ہے پاکستان چار دن کا کھیل ہے اِس قسم کی باتیں کی گئیں۔ اور وہ لوگ ہند کا دامن تھام کر وہیں رہ گئے۔ بعد میں اِس انکار کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ اور چند ہی دنوں کے بعد جب اُن پر مظالم ٹوٹنے لگے اور گھر بار جلا دیئے گئے تو چار و ناچار اُسی زمین کی طرف رُخ کیا ہے جسے وہ مجذوب کی بڑ سمجھتے تھے۔ پھر ایک گروہ ایسا بھی رہ گیا جو ظالم کے سائے میں جینا عین حیات سمجھتا تھا۔ لیکن اڑھائی برس کے بعد مارچ ۱۹۵۰ء میں پھر مسلمان کا قتلِ عام شروع ہوا۔ تو پھر وہ لوگ صرف جان بچانے کے لئے پاکستان کی طرف بھاگے۔ کیا انہیں اپنا کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ لوگ ان میں سے نہیں ہیں جنہوں نے انکار کی راہ اختیار کی تھی؟ کیا ہند اگر امن کی ضمانت دیدے تو یہ لوگ پھر ہم سے الگ ہو کر واپس دشمن کی پناہ میں نہیں چلے جائیں گے؟ ضرور چلے جائیں گے۔ تو کیا انہیں یہ کہا جائے کہ ہماری ملّت میں سے ہیں؟ اور ہمارے دین

میں سے ہیں؟ اور ایک مرکز کے ماتحت ہیں؟ افسوس کہ ابھی وہ شے جو شرفِ انسانیت سے آگاہ کرتی ہے ان کے سامنے عریاں طور پر نہیں آئی۔

جوہرِ زندگی ہے عشق۔ جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ہیں!

یہ کہتے ہیں کہ ہمارا سب کچھ ہند میں رہ گیا ہے۔ انہیں اینٹ پتھر کے مکانات عزیز ہیں۔ انہیں وہ زمین محبوب ہے جس پر یہ سر جھکا کر چلیں اور سر اٹھا کر چلنے کی اجازت نہیں اُن کا عذر ہے کہ پاکستان میں آکر غریب ہوجائیں گے۔

کلیمی نا مسلمانی خودی کی
کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی
تجھے گر فقر و شاہی کا بتادوں!
غریبی میں نگہبانی خودی کی!!

یہ ان برتنوں کی یاد میں آنسو بہا رہے ہیں جن کی قیمت چند روپے ہے یہ اُس اثاثہ کو رُو رہے ہیں جسے ہر وقت ہندو لوٹ سکتا ہے اور نہیں واقف کہ ہم کون ہیں اور کیا بنکر جینا ہے۔

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

یہ چار کروڑ مسلمان اقلیت کے نام سے پکارے جارہے ہیں اور ہندو کے

رحم و کرم پر سانس لے رہے ہیں۔ وہ جب چاہے ان کی آبرو چھین لے یہ وہ مسلمان ہیں جن کے متعلق زمانے کا فیصلہ ہے کہ۔

سے

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

اور جس کے لئے حکم ہے کہ:۔ سے

خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر — فروغالِ محمود سے درگذر
تیری آگ اِس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

علمِ اقبال

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ - وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ - ۲۹/۶۴

یہ زندگی تو محض کھیلنے کودنے کی زندگی ہے بچپن کا زمانہ ہے۔ زندگی تو درحقیقت اس کے بعد کی منزل ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ زندگی ایک مسلسل شے کا نام ہے غیر منقطع جہاں کوئی شے رک جائے وہ اس کی موت ہوتی ہے۔ ؎

زندگانی از خرامِ پیہم است ۔۔۔ برگ و سازِ ہستی موج از رم است

موجودہ دورِ حیات کے لہو و لعب ہونے کے متعلق ارشاد ہے۔ ؎

زمین خاکِ درِ میخانۂ ما ۔۔۔ فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است ۔۔۔ جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

ذرا اس "خاکِ درِ میخانہ" اور "گردش یک پیمانہ" کے ٹکڑوں کو دیکھیے اور پھر سامنے لائیے۔ آیت مذکورہ کے اس حصّہ کو کہ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ - اور اس "دیباچۂ افسانۂ ما" کے ساتھ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ کو یہ موجودہ زندگی تو محض دیباچہ ہے اصل کتاب تو ابھی شروع ہونے والی ہے۔

ہر چند مضمون طویل ہو رہا ہے لیکن جی نہیں چاہتا کہ ایک چیز سامنے

آجائے اور اسے یونہی چھوڑ کر آگے گذر جائیں ۔ حدیثِ سوز و سازِ بادراز است ، کے لئے مجھے نظریۂ ارتقا بیان کرنا چاہئے ۔ لیکن جیساکہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں یہ ایک الگ موضوع ہے ۔ جس کا ضمناً لکھنا دشوار ہے ۔ یہاں صرف حضرت علامہ کے اس مصرع کے متعلق کچھ اشارات ضروری ہیں قرآن کریم میں ارتقاء کے ضمن میں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالےٰ ایک تدبیر کرتا ہے ۔ پھر اس تدبیر کو پختگی کی حد تک پہونچانے کے لئے اسے مختلف مراحل طے کراتا ہے ۔ قطرہ کو گہر ہونے تک گوناگوں مقامات سے گذرنا ہے ۔ ایک ایک مقام اور ایک ایک منزل کا نام یوم ہے (بمعنی دن) لیکن یہ ایام ہمارے گردشِ لیل و نہار کے ایام نہیں ؛ بلکہ ان کا طول ہمارے حساب سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے ۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ۔ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۳۲/۵

وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیرِ امور کرتا ہے پھر وہ امر (بہ پختگی اختیار کرے) اسکی طرف بلند ہوتا ہے ۔ ایک دن میں جس کی مقدار انسانوں کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ہزار سال ہو سکتی ہے ۔

دوسری جگہ ہے کہ بعض ایام پچاس ہزار سال کے بھی ہوتے ۔ اسی کرۂ ارض کو دیکھئے ۔ اپنی اصل سے الگ ہونے کے بعد (جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے) کتنے عرصہ دراز میں اس قابل ہوئی ہوگی ۔ کہ اس پر کوئی ذی روح آباد ہو سکے اسی طرح انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لئے منازل

طے کرنی ہوگی۔ اور اس میں کتنا وقت صرف ہوگا۔ اب پھر دیکھئے کہ

حدیثِ سوز و سازِ ما درازاست

کس قدر سچی حقیقت ہے۔ اور کس قدر لطیف پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ اسی کو دوسری جگہ ذرا زیادہ شوخی سے لکھتے ہیں کہ

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں / کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

ہاں: تو کہنا یہ تھا کہ موت زندگی کو ختم کرنے والی شئے نہیں۔ بلکہ یہ تو ایک نئی زندگی کا دروازہ ہے۔

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است / زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

اسی عنوان پر دو ایک شعر اور بھی دیکھتے جایئے۔ کبھی شعروں کو دیکھئے اور کبھی اپنے قلب و دماغ کو کہ ایک ہی ثانیہ میں ان اشعار نے انہیں علم و ادراک کی کن بلندیوں اور کیف و نشاط کی کن جنتوں میں پہونچا دیا ہے۔ ایسے شعر کہہ دینا درحقیقت فیضان ہے۔ اس کتابِ مبین کی ضیا پاشیوں کا جس کا دعوےٰ ہے کہ آؤ۔ تمام نوعِ انسانی مل کر اس کی ایک سورت کی مثل کوئی چیز پیش کرکے دکھاؤ۔ ایسے شجرِ طیب کے برگ و بار بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ فرماتے ہیں ؎

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے / ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

پیامِ فرنگ کے دو شعر ہیں ؎

زندگی جوئے رواں ست و رواں خواہد بود / این مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم / صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم،

اس آخری شعر کو ملاحظہ فرمائیے۔ شعلہ کی شکست اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ خاکستر بن کر رہ جائے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ، چمک، حرارت پیدا ہو جائے۔ انسانی ہیولیٰ میں ہر چند "نورانیت" کا عنصر موجود ہے لیکن ابھی "مادیت" کا عنصر زیادہ غالب ہے اس لئے حقائق اشیاء پر ظلمتوں کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس ہیولیٰ کی شکست اس لئے ہو گی۔ کہ اس کے بعد شعلہ کی حرارتیں سمٹ کر شرر بن جائیں اور وہ اس آتشدانِ خاکی سے اڑ کر فضائے نور کی ان وسعتوں میں جا پہونچے جن کے لئے لا شرقیہ و لا غربیہ آیا ہے۔ جو مکانیت کے موجودہ تصورات کے دائرہ سے باہر ہیں۔ یعنی اِدھر سکراتِ موت کی ہچکی آنکھ بند کرے اور اُدھر نورانی ملائکہ استقبال کے لئے آجائیں کہ حضور آئیے۔ تشریف لائیے۔ دیدہ و دل فرشِ راہ۔ یہ نورانی وادیاں یہ دل و نگاہ کو سکون و اطمینان کی ٹھنڈک پہونچانے والی حسین جنتیں آپ کے انتظار میں ہیں۔

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ ۔ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ ۱۶/۳۲

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ملائکہ نہایت آسودگی کی حالت میں وفات دیتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم پر سلامتی و رحمت ہو۔ آئیے جنت میں داخل ہو جائیے۔ بوجہ ان اعمال کے جو تم نے کئے ہیں۔

اس آیت کو سامنے رکھئے اور پھر اس شعر کو پڑھئے کہ

شعلہ بودیم وشکستیم وشرر گردیدیم صاحبِ ذوق وتمنا ونظر گردیدیم

پھر جنت کے متعلق جو اس آیت میں۔ اور دیگر متعدد آیات میں، آیا ہے
کہ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْن یعنی جنت اعمال کی جزا ہے اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ

آن بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست

زندگی کے تسلسل کے متعلق غزل کا بھی ایک شعر سنئے۔ اور دیکھئے کہ غزل
کی رنگینی باقی رکھتے ہوئے بھی حقائق کیسے بیان کئے جا سکتے ہیں، فرماتے ہیں

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

قیامت کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔ کہ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ، جب
نفوس کو (پھر سے) اٹھایا جائے گا۔ یا ملایا جائے گا۔ خاک اپنی پریشانی
کے بعد پھر سے "دل" بن جائے گی۔ اس غزل کا دوسرا شعر ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

اس شعر میں انسان (آدم) کے ہبوط وصعود کی حقیقت کس قدر دلآویز
پیرایہ میں بیان کی گئی ہے تخلیق آدم کا قصہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ اس
کے بعد ہبوطِ آدم کا ذکر ہے۔ ہبوط کے معنی نیچے گرنے کے ہیں، آدم
کے جنت سے نکلنے کے لئے قرآن کریم نے خروج (نکلنا) کا لفظ استعمال
نہیں کیا بلکہ ہبوط (نیچے گرنے) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس ہبوط کی
رعایت سے آدم کو ٹوٹا ہوا تارہ کہنا کس قدر موزوں ہے۔ کہ تارہ جب
ٹوٹتا ہے تو نیچے گرتا ہے۔ پھر حضرت آدم نے اپنے ہبوط کا جو اثر بیان کیا
تھا وہ یہ تھا کہ اے بارالٰہ! اگر ہماری توبہ قبول نہ ہوئی۔ اگر ہمیں اپنی

حالت میں نہ پہونچایا گیا تو لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔ ہم نقصان اٹھانے والوں
میں سے ہو جائیں گے۔ لوٹا پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ اس
ہبوط کے ان تمام ارتقائی منازل کو طے کر کے پھر ایسا عروج حاصل کرنا
کہ تارہ مہ کامل بن جائے۔ اسکی عظمتیں اور رفعتیں پہلے سے بھی زیادہ
بڑھ جائیں۔ یہ ہے وہ راز جو ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ اور جس
کی وجہ سے یہ انجم یوں سہمے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ
اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ فَلَهُمْ
اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (والتین)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا۔ پھر اسے (اس کے اعمال
کی بدولت) نچلے سے نچلے درجہ میں لوٹا دیا۔ مگر سوائے ان کے جنہوں نے
ایمان کے ساتھ اعمال صالح کئے۔ پس ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے۔

ان میں ایمان و عمل صالح پیدا ہونے دیجئے پھر دیکھئے کہ یہ
شہباز کن بلندیوں پر اُڑتا ہے ایسی فضاؤں میں جو حدود نا آشنا ہیں
(غیر ممنوں) اسی پرواز کی پہلی منزل ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں۔

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد   این مشتِ غبارے را انجم بہ سجود آمد

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہی فرق ہے یورپ کے نظریہ عروج
اور ایک مسلم کے نظریہ عروج میں۔ یورپ کا مادہ پرست انسان کی پرواز
اس دنیا۔ یا زیادہ سے زیادہ کسی قریبی ستارے مثلاً مریخ وغیرہ

تک سمجھتا ہے۔ اور وہ بھی محض جسمانی پرواز۔ جو پھر مادی پرواز ہی ہے اور اسی زندگی سے متعلق ہے لیکن قرآن کریم انسان کو بہت اونچا لے جاتا ہے۔

کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ایسے مبارک درخت کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کے اوپر ہوں اسلئے حضرت علامہ فرماتے ہیں۔ کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اس چیز کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ارتقائی منازل کو "عشق کے امتحاں" کہہ کر خشک فلسفہ کو کس قدر شیریں بنا دیا ہے۔ دوسرے شعر میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کہ یہ بلندیوں کی فضائیں جنہیں قرآنی اصطلاح میں سموات کہا جاتا ہے۔ آبادی سے خالی نہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِن دَابَّةٍ۔ ۴۲/۲۹

اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے زمین و آسمان۔ پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا۔ اور ان دونوں میں جو جاندار پھیلا دیے وہ بھی۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں ان آباد فضاؤں کو کارواں کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ۔ اور ہم نے تمہارے اوپر سات (یا متعدد) رہگذر بنائے یہ رہگذر کاروانوں ہی کے لئے تو ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کارواں در کارواں ہجوم کون کون سی ارتقائی منازل طے کرتے پھر رہے ہیں۔ عشق کی کون کون سی وادیوں میں سرگرداں ہیں۔ پھر چونکہ یہ تمام آبادیاں ایک جوئے رواں کی طرح ہر وقت مصروفِ خرام ہیں، قطع منازل کر رہی ہیں۔ اس لئے ان کو کارواں کہنا ایسا حسین انداز ہے جس کی داد غالبؔ ہی دے سکتا تھا

شعر جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ انہی جذبات سے اس میں دلکشی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے لیکن جب شعر میں حقائق بیان کئے جائیں یا اس کا انداز مصلحانہ۔ اور پیامی ہو جائے تو پھر اس میں بالعموم شعریت باقی نہیں رہتی۔ پھر یا تو وہ شعر اس انداز کا ہو جاتا ہے کہ ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

یا اس انداز کا۔

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ ہے برا وہی کہ جو تجھکو برا جانتا ہے
اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں برا کہنے سے تو اسکے برا مانتا ہے

اور ایک ذوقؔ ہی پر کیا موقوف ہے۔ بڑے بڑے عمدہ شعر کہنے والے جب بیانِ حقائق یا مصلحانہ انداز میں کچھ کہتے ہیں۔ تو شعر بے جان ہو جاتا ہے

لیکن یہ خصوصیت حضرت علامہ ہی کے حصہ میں آئی ہے۔ کہ حقائق اور دقائق بھی اس درجہ دقیق بیان کئے جاتے ہیں۔ اور شعر کے حسن میں بھی کوئی کمی نہیں آتی۔

ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

ستاروں کی دنیا کے متعلق زبور عجم میں فرماتے ہیں۔

گمان مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست
کہ ہر ستارہ جہان است و یا جہاں بود است

ہاں! تو زندگی ایک مسلسل خرام کا نام ہے۔ چلتے جانا۔ بڑھتے جانا۔ اور بڑھتے جانا۔ بڑھتے ہی چلے جانا۔ کہ ؎

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے مقام سمجھا جاتا ہے وہ مقام نہیں۔ جسے منزل کہا جاتا ہے وہ منزل نہیں۔ یونہی ذرا ستانے دم لینے کے لئے۔ گھنے درختوں کا سایہ ہے کارواں کے دوپہر کاٹنے کے لئے نخلستان ہے۔ وہ جنت کہ جسے بالعموم منزل مقصود سمجھا جاتا ہے۔ راستہ کی خوشگوار وادی ہے کہ جنت میں پہونچ کر بھی اہل جنت کی یہ کیفیت ہوگی کہ۔

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ۔

ان کا نور ان کے آگے۔ اور ان کے دائیں کی طرف چلتا ہوگا۔

یہ نور پیشانی کی روشنی۔ یہ سرچ لائٹ۔ بالآخر اگلی منزل کا راستہ دکھانے کے لئے ہی تو ہوگی۔ وہ راستہ جس کے متعلق ارشاد ہے۔ کہ جنت میں پہونچکر بھی وَهُدُوْا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ان کی ایک پسندیدہ راستہ

کی طرف رہنمائی کی جائے گی ۲۲/۲۴ دنیا میں صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا تھی۔ ایک سیدھے راستہ پر چلنے کی، وہاں ایک پسندیدہ راستہ پر چلائے جائیں گے۔ اس لئے جنت مقام نہیں۔ راہ گذر ہے۔ وہاں سے بھی انسان کو آگے بڑھ جانا ہے۔

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند کرشمہ بر دل شاں ریز و دلبرانہ گذر

کہ ملائکہ کا تو یہ تیرا مسجود۔ اُن کا مقام اس کا مقام کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہ "شکار" ہے جس کا اٹھانا بھی تضیع اوقات ہے

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بہ کمند آور۔ اے ہمتِ مردانہ

لیکن بایں ہمہ۔ انسان "لامکان" نہیں ہر ایک مقام سے آگے ہی سہی۔ لیکن مقام اس کا ضرور ہے۔ وہ مقام کیا ہے؟ وہ منزل مقصود کونسی ہے؟ یہ راز ہے جسے کھول کر بیان نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اس کی آج ضرورت تھی۔ آج تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کے بعد اگلی منزل کونسی ہے؟ سو اس کی تفصیل شرح و بسط سے قرآنِ کریم میں موجود ہے اس منتہیٰ کے متعلق تو سرِ دست اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وَاِلٰی رَبِّکَ مُنْتَھٰھَا اس کا منتہیٰ تیرے رب تک ہے۔

شعلہ در گیر زو بر خس و خاشاک من مرشدِ رومی کہ گفت۔ منزل ما کبریاست

لیکن یہاں پہونچکر حضرت علامہ واصل بالحق کے عقیدہ کا اتباع نہیں کرتے کہ قرآنِ کریم کے رو سے انسان کے خدائے واحد کی ذات میں جذب ہو جانے کے عقیدہ کی سند نہیں ملتی۔ لیکن حضرت علامہ اس عقیدے کے

اختلاف میں بھی ایک شانِ انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اسے انسان کی خودی محکم بالذات ہونے کے منافی سمجھتے ہیں، کہ وہ کسی کی ذات میں گم ہو جائے۔ خواہ وہ خدا ہی کی ذات کیوں نہ ہو۔ ان کے نزدیک عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا نہیں۔ بلکہ تہ دریا گہر بن کر بیٹھ جانا ہے۔ آپ فرماتے ہیں

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی — ترا او بیند و اور تو بینی
بخود محکم گذار اندر حضورش — مشو ناپید اندر بحر نورش

"ترا او بیند" تو ہر وقت کا معاملہ ہے۔ وہ کون لمحہ ہے جب خدا انسان کو نہیں دیکھتا۔ لیکن "او را تو بینی" کا مقام اس منزل سے آگے آتا ہے۔ موجودہ مقام میں تو ایک اولوالعزم پیغمبرؑ نے جب یہ آرزو کی، کہ ربّ ارنی۔ تو جواب مل گیا کہ لن ترانی (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا) لیکن اس سے اگلی منزل میں مومنین کی یہ کیفیت ہو گی کہ

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ۔

بہت سے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے

اب خدا بندے کو دیکھ رہا ہے۔ اس وقت بندہ بھی خدا کو دیکھے گا کہ

عبد و مولا در کمینِ یک دگر — ہر دو بے تاب اند از ذوقِ نظر
زندگی ہر جا کہ باشد جستجو ست — حل نشد ایں نکتہ من صیدم کہ اوست

اگر ایک طرف انسان کی تڑپ اور تجسس کا یہ عالم ہے کہ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ۔ اپنے رب کی طرف رواں دواں جائیں گے۔ تو دوسری یہ کیفیت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّھَا زمین اپنے رب

کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا۔ اور تیرا رب اور فرشتے قطار در قطار زمین پر آئیں گے۔ کہ

ہر دو بے تاب انداز ذوقِ نظر

لیکن یہ تمام مراحل طے کس طرح ہوں گے؟ یہ "محکم خودی" حاصل کیسے ہو گی!! یہ اس دنیا میں اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ۔ ہونا۔ یعنی ایسا سخت ہو جانا کہ کوئی اسے ہضم نہ کر سکے۔ کوئی اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ یہ کیسے ہو گا!!! اس تاکی تودے میں فولادی جوہر کیونکر پیدا ہوں گے! یہ نازک سا شیشہ اپنے اندر ایسی سختی کیسے پیدا کرے گا کہ اس کا "زجاج حریف سنگ" ہو جائے۔ اس کے لئے رموز و اسرار میں پورا لائحہ عمل مرتب کر کے دیدیا گیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں۔ لیکن اس سب کا ماحصل ایک نکتہ ہے۔ اور یہی نکتہ دراصل کلامِ اقبال کا محور ہے۔ مرکز ہے۔ محیط ہے۔ سب کچھ ہے یہ نکتہ ہے۔ محمدؐ رسول اللہ۔ فرماتے ہیں۔

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو ۔۔۔ فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں! افرشتہ و حور ۔۔۔ کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

بس یہ ہے رازِ ایک مومن کی پختگی کا۔ اس کی خودی کے استحکام کا۔ کہ شاہین شہ لولاک ہے تو۔ تو ان مقدس ہاتھوں کا پروردہ ہے جن کی شان میں آیا ہے کہ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح) تو تو اس ذاتِ گرامی کا شاہین ہے۔ جو دانائے سبل۔ ختم رسل۔ مولائے کل ہے جو معراج انسانیت کا مظہر کامل ہے جب تو ایسی رفیع الشان بارگاہ کا شاہین ہے تو تیرے

عرش آشیاں ہونے میں کیا کلام ہے۔ لہذا یہ تمام فضائیں اور وفضاؤں کی پہنائیاں یہ سب پستیاں اور تمام بلندیاں۔ یہ ارض و سموات یہ تمام کائنات اور اس کی قیود ناآشنا وسعتیں۔ اس شاہینِ شہ لولاک کے بازوؤں کے نیچے کیوں نہ ہوں۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت عشق کے مرتبہ تک نہ پہونچ چکی ہو۔ کہ رسولؐ کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت قرآن کی اطاعت سے میسر ہوتی ہے کہ حضورؐ قرآن ہی کی اطاعت سکھانے کو تشریف لائے تھے۔

قسم ہے تیرے پروردگار کی۔ ان میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا۔
جب تک اپنے ان تمام معاملات میں۔ جن میں اختلاف کرتے ہیں۔ اے رسول
تمہیں اپنا حُکم تسلیم نہ کرلیں۔ پھر تمہارے فیصلوں پر دل میں بھی کوئی تنگی
اور گرانی محسوس نہ کریں۔ بلکہ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ ۴/۶۵

اسی ایک نکتہ کے اندر امت کی مرکزیت۔ امیر کی اطاعت۔ وحدتِ افکار و عمل اور ان کے جیتے جاگتے نتائج یعنی تمکن فی الارض۔ شان و شوکت حکومت و سطوت۔ زمین پر "آسمانی بادشاہت" کا قیام سرفرازیاں اور سربلندیاں کامیابیاں اور کامرانیاں۔ اور اس کے بعد حیاتِ آخروی میں۔ بعد کی منزل میں آگے بڑھنے کی قوتیں۔ مدارج عالیہ، یہ سب کچھ اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے ضمناً اس بحث کو یہاں چھیڑ دینا پڑا۔ ورنہ یہ تو وہ عنوان ہے۔ جس پر کلام اقبال سے ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

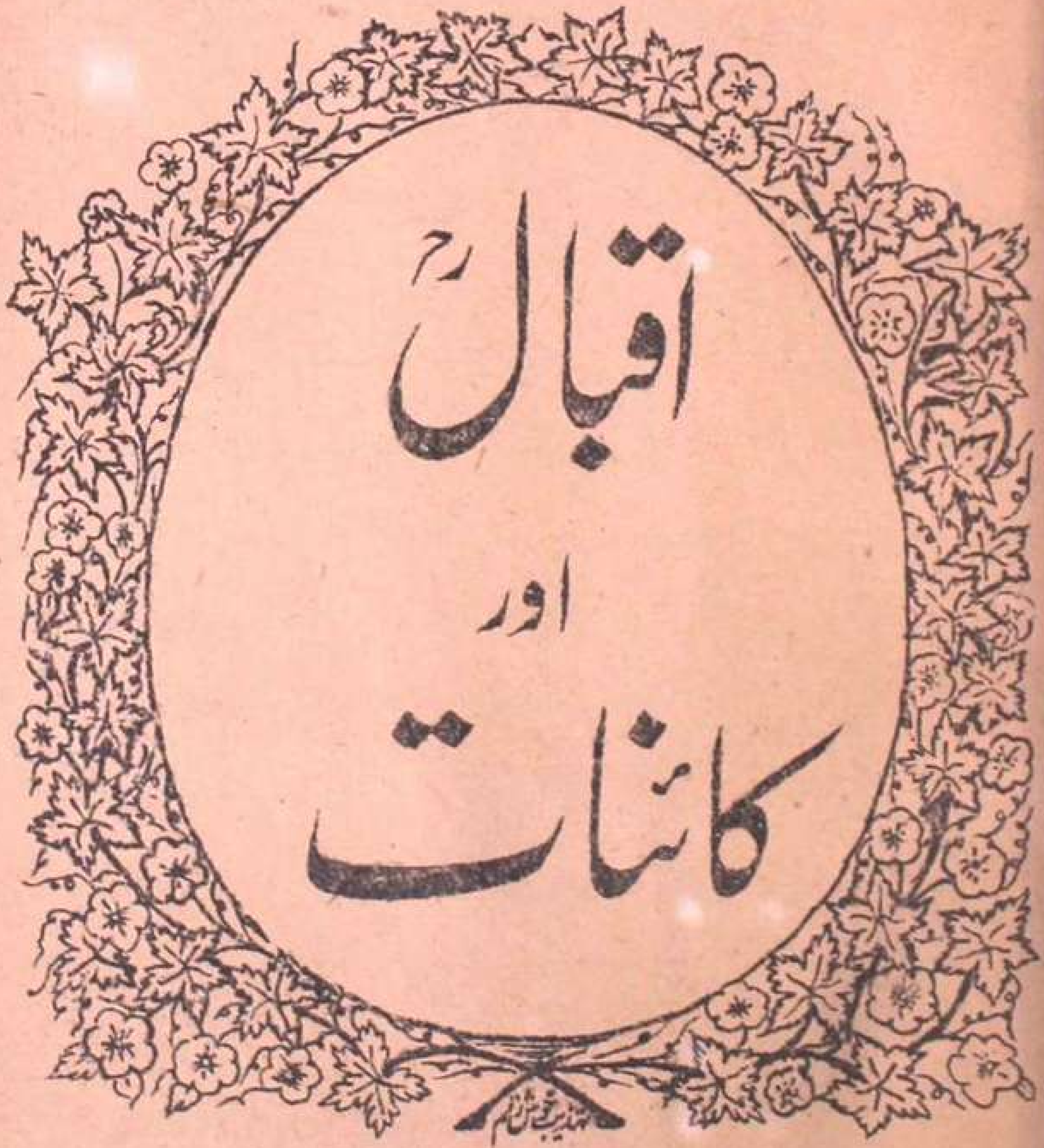
اقبالؔ تمام شاعری اور شاعری کا سوز و گداز رہینِ کرم ہے محبتِ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کا جذبۂ اطاعت کا۔ اسی ذاتِ گرامی کی شعلہ ریز محبت ہے۔ جس نے اقبالؔ کو اقبالؔ بنا دیا۔ ورنہ یہ بھی کہیں "میر مشاعرہ" ہوا کرتے۔ جذبۂ اطاعتِ رسول ؐ نے (جسے وہ عشق کہتے ہیں) اقبالؔ کو اس انداز سے گداز کر رکھا ہے کہ اس کے بربطِ ہستی کے کسی تار کو چھیڑیئے اس میں سے نغمہ وہی پیدا ہوتا ہے۔ اسی چیز نے ان کے سامنے قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا اور قرآنی حقائق نے ان کے کلام میں دمِ مسیحا اور ضربِ کلیم کے اعجاز پیدا کر دیئے۔ فطرت کی کرم گستری نے وہ دماغ عطا کیا تھا جو یکسر علم و حکمت تھا محبتِ رسول ؐ کی موہبتِ عظمےٰ سے وہ قلب منور مل گیا جسے صہبائے ایمان کا مقدس آبگینہ کہنا چاہیئے ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی۔ جو اشیاء کی حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے۔ جو گل و خار کے نظر فریب امتیاز سے ہٹ کر شاخ و گل کے اندر جا کر مشاہدہ کرے کہ " درونِ او نہ گل باشد نہ خار است " اس نگہِ حقیقت شناس کا نام ہے اقبالؔ یعنی قلب و دماغ کا مجموعہ۔ ایمان و حکمت کا فشردہ۔ زیرکی و عشق کا عصارہ اذیس و بو علی کا مرکب مجسمہ۔ رومیؔ و رازیؔ کا مشترکہ شاہکار۔ وہ مشرق مغرب کا مقامِ اتصال۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات — شرقیاں را عشق رازِ کائنات

زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیز دہ

اور یہی وہ امتزاجی کیفیت ہے جو قرآن کریم ایک مومن کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے


اقبالؒ
اور
کائنات

اقبالؒ اور کائنات

سائنس اور مسلمان کائنات کے بارے میں کچھ سمجھنے یا کہنے سے پہلے اس حقیقت پر یقین رکھنا ضروری ہے کہ یہ ساری کائنات قرآن کے تابع ہے۔ کُل نظامِ کائنات نظامِ قرآن ہے اور اس میں بسنے والے انسانوں کے لئے قرآن مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اسی دستورِ اکمل کے ماتحت ساری کائنات درخشندہ و فرخندہ نظر آرہی ہے۔ ہر وہ انسان جو قرآن کے قانون کو تسلیم کرے۔ مان لے یا ایمان لے آئے مسلمان ہے۔ یہ مغرب کی ستم ظریفی ہے کہ اس شخص یا جماعت میں جس نے قرآن کو مان لیا تاریخی طور پر ایک فقرہ نہیں کہتا کہ اس مسلم یا مسلم جماعت نے قرآن کی تحقیق کا کام بھی کیا تھا۔ حالانکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جو شخص کسی شے پر یقین کرلے یا تو اس نے یقین سے پہلے تحقیق کرلی ہے یا یقین کے بعد اپنے شکوک رفع کرنے کے لئے تحقیق کرگیا۔ بہر حال دونوں حالتوں میں تحقیق ضروری ہے ورنہ وہ شخص اس کی طرف سے منہ موڑ لے گا۔

جب ہم مغرب کے کسی مصنف کی لکھی ہوئی تاریخِ سائنس کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس تاریخ کی ابتداء اہلِ مصر اور اہلِ بابل کے وقت سے کی

جاتی ہے۔ جنہوں نے اب سے تقریباً پانچ ہزار برس قبل منظم طور پر علم کا ذخیرہ فراہم کرنا شروع کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا مصنف علم کی اس ترقی کا ذکر کرتا ہے جو مصری اور بابلی تہذیب و تمدن کے جانشینوں نے کی۔ یونانیوں اور رومیوں کے ذریں عہد کے کارناموں کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ طویل ابواب اہلِ یونان کے انکشافات کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ اور پھر اس کا مصنف ایک ہی جست میں ایک ہزار برس کی عمر کو طے کر جاتا ہے۔ ابھی ہم ایک صفحہ پر اس نظام شمسی کا ذکر پڑھ رہے تھے جس کو بطلیموس نے چوتھی صدی عیسوی میں پیش کیا تھا اور ورق اُلٹتے پر ایک دم ہماری نظروں کے سامنے کوپرنیکس کا بیان ہوتا ہے جس کا زمانہ چودھویں صدی کا ہے۔ گویا اس مصنف کے نزدیک یہ درمیانی ہزار برس سائنس کی تاریخ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہمارے ذہن جو قدرت میں ہر جگہ تسلسل اور تدریجی ارتقار کو دیکھنے کے عادی ہیں اس عدم تسلسل کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ کوئی سمجھ دار انسان جو ہماری نوع کے ارتقار کی تاریخ سے واقف ہے۔ اسے قبول نہیں کر سکتا کہ دس صدیوں تک انسانوں نے قدرت کے علم میں کوئی ترقی نہیں کی۔

اِدھر مسلم کا یہ عالم کہ اس کی تحقیق کی قرآن شریف شہادت دے رہا ہے۔

”جو اُٹھتے بیٹھتے اور سوتے الٰہی اعمال کے تصور سے غافل نہیں ہوتے اور جو کائناتِ ارضی و سما پر غور کرنے کے بعد یہ اعلان کرتے ہیں کہ اے رب دنیا میں کوئی چیز بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی۔“

(سورہ آلِ عمران ۱۹۱)

مامون رشید (عباسی خلیفہ) کے عہد میں ۱۷۲ رسد گاہیں اجرام سماوی کے معائنہ کے لئے نصب تھیں۔ حیوانات۔ طیور۔ جمادات اور نباتات پر ۴۲ ہزار کتب تصنیف ہو چکی تھیں۔ وہ گھڑیاں بنا رہا تھا۔ انجن چلانے کی کوشش میں تھا۔ زمین کو ناپ رہا تھا۔ اور زمین و آفتاب کا درمیانی فاصلہ معلوم کر رہا تھا۔ تگ و دو۔ جستجو اور تلاشِ مسلسل کا نام عشق ہے۔ یہی ذوقِ تحقیق مسلمان کی زندگی کا جزوِ اعظم رہا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ محققانہ زندگی بسر نہیں کی۔ جبکہ۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں۔ عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

اِس شرح وبسط سے معلوم ہوا کہ مسلم کا نصب العین کیا رہا ہے اور وہ سائنس کی دنیا میں کس قدر بلند مقام پر تھا۔ اور اس کی فطرت کس قدر غور وفکر کی فطرت تھی۔ جسے اللہ نے ہدایت فرمائی۔

اللہ وہ ہے جس نے آسمان سے بارش برسا کر مختلف قسم کے نباتات اُگائے۔ سبز رنگ پودے پیدا کر کے اُن سے خوشے نکالے اور کھجوروں کے ساتھ پھلوں کے وہ گچھے لگائے جن تک تمہاری سائی ہوسکتی ہے۔ اللہ نے مختلف اور مماثل قسم کے انگور۔ زیتون اور انار و کی جنتیں پیدا کیں۔ پھلوں کے لگنے اور پکنے پر غور کرو۔ ان نباتات میں اہلِ ایمان کے لئے معجزات واسباق موجود ہیں" (سورہ انعام ۱۱)

زمانۂ حال کے سائنسی مورخوں کو جب اس فروگذاشت کا احساس ہوا تو اُن میں سے جو لوگ کسی قدر کم متعصب اور تنگ نظر تھے اُنھوں نے اعتراف کرنا شروع کیا کہ اس درمیانی ایک ہزار برس میں عربوں اور دوسری مسلم قوموں نے علم کی شمع کو روشن رکھا لیکن ایک عرصہ کی تنگ نظری اور تعصب سے چونکہ یہ لوگ بھی اپنے دل ودماغ کو پوری طرح پاک اور صاف نہیں کرسکے اس لئے اس اعتراف کے باوجود یہی کہتے رہے کہ مسلم اقوام میں اُپج کچھ نہیں تھی اور نہ اُنھوں نے کوئی بڑے انکشاف کئے بلکہ اُن کا کارنامہ صرف اسی قدر ہے کہ اُنھوں نے اپنے پیشرووں کی معلومات کو زندہ رکھا اور نشاۃ ثانیہ کے بعد اسے جوں کا توں یورپی اقوام کے حوالہ کر دیا۔

مغرب کو بجلی پر بڑا ناز ہے اور ڈھینگ مارتا ہے کہ یہ ہمارا اعجاز ہے اور ہم نے بجلی کی قوت سے زمین پر آباد ہر شے کو زندگی دی ہے لیکن قرآن اس بجلی کے متعلق پہلے

اعلان کر چکا ہے۔

"بجلی کی چمک جس سے تم میں بیم ورجا کی کش مکش پیدا ہو جاتی ہے

اللہ کے معجزاتِ تخلیق میں سے ہے۔ ربِ کائنات آسمانوں سے

بارش برسا کر (اور نائٹروجن کو زمین پر ڈال کر) مردہ زمین کو حیات نو

عطا کرتا ہے۔ اربابِ عقل کے لئے ابر و برق میں اسباق موجود ہیں"

(روم - ۲۴)

انسانی بدن کی طرح زمین بھی کئی بیماریوں کا شکار بن جایا کرتی ہے۔ آسمانی بجلی زمین کے ان تمام روگوں کا واحد علاج ہے جب بجلی کی لہریں ہوا سے گزر کر زمین کو چھوتی ہیں تو مردہ زمین کی نس نس میں عناصرِ حیات بیدار ہو جاتے ہیں اور زمین تولید کے لئے پھر تیار ہو جاتی ہے۔ مسلمان نے از روئے قرآن بارش کا تجزیہ کیا اور ثابت کیا کہ اس پانی میں وہ گیسیں موجود ہیں جو شادابیوں کا باعث ہیں۔ حضرتِ علامہ نے بارش کی زبان بن کر اس حقیقت کی تائید فرمائی ہے۔

مجھ کو قدرت نے سکھایا دُر افشاں ہونا
ناقۂ شاہدِ رحمت کا حدی خواں ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا
رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا

بن کے گیسو رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں
سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے
اور پرندوں کو کیا محوِ ترنّم میں نے
سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قُم میں نے
غنچۂ گُل کو دیا ذوقِ تبسّم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

مغرب نے آج معلوم کیا ہے کہ زمین کو چونے کے علاوہ سلفورک ایسڈ۔ فاسفورک ایسڈ۔ نائٹرک ایسڈ اور پوٹاش کی بھی ضرورت ہے لیکن ربِ کائنات نے پہلے سے ہی اس کی ضرورت کے سامان فراہم کر رکھے ہیں۔ اگر ہم خود ان چیزوں کی تلاش میں نکلتے اور پہاڑ کھودتے پھرتے تو صدیاں صرف ہو جاتیں اور ممکن ہے کہ پھر بھی کوئی مفید نتیجہ نہ نکلتا لیکن اللہ نے اپنے بندوں کو اس علم سے بھی آگاہ کیا۔

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے فضائی بلندیوں سے پانی اُتارا جو زمین کی درزوں میں داخل ہو کر پھر چشموں کی صورت میں باہر نکل کر اور ان چشموں سے (جن میں مختلف عناصر شامل تھے) رنگ برنگ کھیتیاں نمودار ہوئیں"۔ (۲۲)۔

ربِ رحیم نے ان مشکلوں کو یوں حل کیا کہ پہاڑوں پر برف جمع کر دی جو پگھل کر پہاڑوں کی شگافوں میں چلی گئی اور جب یہ پانی چشمہ بن کر کہیں سے نکلا تو پوٹاش اور سلفر وغیرہ کی ایک دنیا ہمراہ لے آیا۔ چشمے دریا بنے اور دریا نہروں میں منقسم ہوئے اس طرح یہ پانی تمام لوازماتِ زندگی

کو ساتھ لے کر کھیتوں تک پہنچا۔ مغرب نے ان غیر پوشیدہ خزانوں کو پوشیدہ کہا۔ اور کہا کہ ہمارے علم و ادراک کے فیض کا اعجاز ہے کہ یہ خزانے دنیا پر نمایاں ہو گئے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں۔

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک
اگرچہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک
یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک
تو بے بصر ہو تو یہ مانعِ نگاہ بھی ہے
وگرنہ آگ ہے مومن جہاں خس و خاشاک
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

واقعہ یہ ہے کہ چند مستشرقین کے سوا یہ مورخ۔ مصنف یا عوام مسلمانوں کی تحریروں اور اور اصلی ماخذوں پر دسترس نہیں رکھتے۔ مسلمانوں کے کارناموں اور اُن کے تہذیب و تمدن کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ لوگ ان تحریروں پر بھروسہ کرتے ہیں جو صلیبی جنگوں کے زمانہ میں اور اس کے بعد پادریوں اور اربابِ کلیسا نے لکھ چھوڑی ہیں ان پادریوں نے اپنے مخالفین کی بُرائی کرنے میں اور واقعات کو غلط۔ دش میں بیان کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تا کہ عیسائی اقوام کی ہمدردی اور امداد حاصل کر سکیں۔ بعد کے مورخوں اور مصنفوں نے انہی پادریوں سے اپنا مواد حاصل کیا اور وہی واقعات اس روشنی میں دہراتے چلے گئے۔ جو اربابِ کلیسا نے گھڑے تھے ؎

کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک روز — کتاب صوفی و مُلّا کی سادہ اوراقی

حال میں سائنسی تاریخ میں ایک اور رجحان پیدا ہو چلا ہے جس سے مسلم عوام کم واقف ہیں۔ یہ گویا ایک قسم کی منظم سازش ہے جو متمدن دنیا میں مسلمانوں کے خلاف پھیل رہی ہے اور اگر وقت پر اس کا سدِ باب نہ کیا گیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ سائنس کی تاریخ سے مسلمانوں کا نام حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ مسلمانوں کے جن انکشافوں اور کارناموں سے اب تک ان کے بدترین دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے تھے۔ انہی انکشافوں کا سہرا اب بتدریج دوسرے لوگوں کے سر باندھا جا رہا ہے۔ اگر ہم افراد اور قوموں کی نفسیات پر غور کریں تو اس رجحان کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں بعض افراد اس مربی کے بارِ احسان کو برداشت نہیں کر سکتے جس کی طاقت اور ثروت زائل ہو چکی ہو۔ یہ لوگ ہر قسم کی ممکنہ کوشش اس امر کے ثابت کرنے میں صرف کریں گے کہ ان کی گردن پر اس مربی کا کوئی احسان نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس مربی سے انتقام لینے کی بھی کوشش کریں گے کہ اس نے اپنے احسان سے انھیں نادم کیا تھا۔ اقوام کا بھی یہی حال ہوتا ہے اور ہم کو خود اپنے زمانہ میں اس کا تجربہ ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں نازی جرمنی میں اور دوسرے فاسطی ملکوں میں یہودیوں کے خلاف جو جذبۂ نفرت بھڑکا ہوا ہے اس کی اقتصادی اور سیاسی وجوہ کے علاوہ یہی نفسیاتی وجہ بھی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ اگر قوموں کی قومیں مسلمانوں سے انتقام لینے پر تُلی ہوئی ہیں کہ ہزار برس تک وہ ذہنی اور سیاسی حیثیت سے ساری دنیا پر چھائے رہے ہیں۔ اور مسلمان کی سادگی دیکھیے۔

شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پُجتے ہیں کعبے کے برہمن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

مسلمان کی اپنی شخصیت سے بغاوت کا نتیجہ سامنے ہے۔ مورخ کانٹور جرمنی زبان میں علوم ریاضی کے متعلق لکھتا لکھتا عربوں کے متعلق لکھتا ہے کہ۔

"یہ وہ لوگ تھے جو صدیوں تک اپنے ہمسایوں کے تمام تہذیب و تمدن کے اثرات سے باہر تھے۔ جنھوں نے خود اس تمام عرصہ میں دوسروں پر کوئی تمدنی اثر نہیں ڈالا۔ پھر یکایک ان لوگوں نے اپنا مذہب اپنے قانون اور اپنی زبان کو دوسری قوموں پر اس حد تک مسلط کیا جس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ اس قدر غیر معمولی واقعات نہیں کہ ان کی وجوہات کا کھوج لگانا بے سود نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ذہنی بلوغ اور پختگی کا یہ دفعتاً ظہور بذاتِ خود ناممکن ہے۔"

گویا کانٹور کا یہ مطلب ہے کہ عربوں میں یہ ذاتی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اس ذہنی بلندی پر آپ سے آپ پہنچ سکتے۔ اس ایقان کو اپنے دماغ میں جما کر وہ عربوں کی تاریخ ریاضی تحریر کرتا ہے۔ اور محمد بن موسیٰ الخوارزمی اور دوسرے مسلمان علماء کے کارناموں کو یونانیوں اور دوسری قوموں کے آغوش میں ڈال دیتا ہے۔ پھر ہمارے اکثر بھائی بندوں کو تنکے کا سہارا مل جاتا ہے اور وہ کانٹور کے اور اسی کی ذہنیت رکھنے والے مغربی مورخین کے حوالہ سے مسلمانوں کے تمام کارناموں کو اپنے ہم قوم افراد سے منسوب کرنے لگتے ہیں۔

اغیار جان توڑ کوشش میں ہیں کہ مسلمانوں کے کارناموں کو اپنا کر علم و حکمت کی تاریخ سے مسلمانوں کا نام خارج کر دیا جائے۔ پیسہ کی ان کے ہاں کمی نہیں ہے اور

پریس ان کے ہاتھ میں ہے، اخباروں میں آرٹیکل اور رسالوں میں مضامین نکلتے ہیں۔ آئے دن مقالے اور کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ پھر یہ زمانہ ہی پروپیگنڈے کا ہے جو اپنا ڈھول جس قدر زیادہ پیٹے دنیا اُسے ماننے کے لئے تیار ہو جاتی ہے لیکن جب غیروں سے توقع ہی نہیں تو ان کی شکایت کیا کی جائے۔ ہمیں تو رونا اپنوں کا ہے جو پہلے ہی سے احساسِ پستی میں مبتلا ہیں۔ اور اب اغیار کے پراپیگنڈے سے بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ سائنس اور خصوصاً ریاضی کو مسلمان طالب علم ایک مصیبت اور ہوّا سمجھتے ہیں۔ اور نہ صرف عوام بلکہ پڑھے لکھے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات جم گئی ہے کہ مسلمانوں کو یہ علوم آتے ہی نہیں۔ اب مسلمانوں کے لئے یہ چار سطریں رہ گئی ہیں۔

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو

یہ طعن غیروں کی طرف سے نہیں اپنوں کی طرف سے ملتے ہیں غیر ہمیں ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور یوں مخاطب کرتے ہیں۔

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یہ بھی قسمت کا عجیب پھیر ہے کہ ہمیں اپنے اسلاف کے کارنامے بیان کرنے

کے لئے مغربی علماء اور مورخین سے سند لانی پڑتی ہے۔ ورنہ محض ہماری بات یا عربی اور فارسی تاریخوں کی شہادت ہمارے جدید تعلیم یافتہ بھائی کیوں ماننے لگے۔ ان کی تشفی اور اطمینان کی خاطر یہ کرنا پڑتا ہے کہ مغرب کی ورق گردانی کے بعد استدلال نوٹ کر کے ان کے سامنے پیش کریں۔ کس قدر باعثِ ندامت ہے ہمارے لئے۔

رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا

امریکی مصنف پروفیسر کجوری نے ریاضی کی تاریخ لکھی ہے اور وہ ہمارے متعلق رقمطراز ہیں کہ:-

"تمدن کی تاریخ میں عرب ایک غیر معمولی منظر پیش کرتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کے گمنام جاہل اور منتشر قبیلے جس کو سلطنت اور جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا دس برس کے اندر مذہبی جوش کی بھٹی میں سے گذر کر ایک طاقتور قوم بن جاتے ہیں۔ اور پھر یہ قوم ایک صدی کے عرصہ میں اپنی حکومت ہندوستان سے لیکر شمالی افریقہ اور ہسپانیہ تک پھیلا دیتی ہے۔ اس فتح وظفر کے ایک سال بعد یہ لوگ علمی معاملات میں دنیا کی رہبری کرنے لگتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اپنے زمانے کے بڑے عالم بن جاتے ہیں۔"

مغربی مورخوں یورپ کے ہیئت دانوں اور سائنس دانوں کے سر اُن انکشافات

کا سہارا رکھا ہے جو ایک عرصہ پہلے عربوں نے کئے تھے۔

"چھٹی صدی سے سولھویں صدی تک براعظم یورپ نے کوئی ہئیت داں پیدا نہیں کیا اس زمانہ میں علم و ادب کا سارا میدان عرب مشاہدین سے بھرا ہوا تھا۔ یورپ کا کوئی باشندہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان ہئیت دانوں کے انکشافات اصل ہیں۔ ان انکشافوں سے علم ریاضی کی ان ترقی یافتہ اور اعلیٰ قسم کی معلومات کا پتہ چلتا ہے جن کو عربوں نے دریافت کیا تھا۔"

مگر وہ علم کے موتی جواہر اپنے آبا کے
جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اب دیکھئے کہ اسلام نے سائنس کی کیا خدمات انجام دی ہیں؟

ظہور اسلام سے قبل مشرق قریب اور مغرب کے تمام ملکوں پر کلاسیکی یونانی فلسفہ مسلط ہو چکا تھا اور ہر کس علمی مسئلہ کے متعلق ارسطو کا قول فیصل سمجھا جاتا تھا۔ یونانیوں کے نزدیک علم حاصل کرنے کا طریقہ خیال اور فکر ہی تھا۔ تجربہ اور مشاہدہ کی ان کے ہاں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ کیونکہ اُن کے خیال میں تجربہ اور مشاہدہ سے صرف قیاس علم حاصل ہوتا ہے۔ حقیقی علم حاصل نہیں ہوتا۔

منظر چمنستان کے زیبا ہوں کہ نازیبا
محروم عمل نرگس مجبور تماشا ہے

کائنات کے متعلق ان کا تصور سکوتیاتی تھا۔ جس کا ثبوت ان کی جیومیٹری سے ملتا ہے۔ جس میں حرکت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر لفظوں خطوں

اور شکلوں کو حرکت دی جائے تو اس سے ان کی ہیئت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ صرف سائنس میں بلکہ فنونِ لطیفہ میں بھی یونانیوں کا آئیڈیل سکونیاتی تھا۔ چنانچہ جتنے قدیم یونانی مجسمے دستیاب ہوتے ہیں اُن میں شکلوں کو سکون اور جمود کی حالت میں بتایا گیا ہے۔ اور اس کے برعکس تاریخِ اسلام بتاتی ہے کہ مسلمان۔

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی
یہ ہستی دانا ہے بینا ہے توانا ہے

اسلام نے سب سے پہلے یونانیوں کے فلسفہ اور سائنس کے خلاف بغاوت کی۔ اسلام نے لوگوں کو سکھایا کہ دنیا جیسی بھی کچھ ہے اسی سے کام لو اور اسی کے ساتھ دلچسپی رکھو۔ خواب و خیال کی دنیا سے ایک حقیقت شناس مسلم کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر فطرت سرگرم تقاضا ہے

حضرت علامہ اقبالؒ نے تشکیل جدید النبیات اسلامیہ پر جو لکچر دیئے ہیں ان میں اس نکتہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق کائنات ساکن اور جامد نہیں ہے۔ بلکہ متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ قدرت کے کارنامے میں سکون ممکن نہیں ہے۔ برگسان نے تخلیقی ارتقاد کا جو مفہوم قائم کیا ہے۔ تو کتاب اللہ میں متعدد مقامات پر موجود ہے۔ چنانچہ خالقِ عالم کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَان یونانیوں کے برخلاف کائنات کا یہ حرکیاتی تصور حقیقت کے بالکل قریب ہے۔ اس کے علاوہ تحصیل علم کے طریقوں کے متعلق بھی قرآن نے یونانیوں کی تردید

کی ہے۔ یونانیوں کے نزدیک علم حاصل کرنے کا واحد طریقہ فکر و خیال تھا۔ لیکن قرآن مجید نے بتایا کہ تحصیلِ علم کے دو طریقے ہیں ایک تاریخ اور دوسرے مشاہداتِ قدرت۔"

"ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ محض تماشے کی خاطر پیدا نہیں کیا۔" ٥ (دخان ۳۷)

قرآن کریم نے کائنات کی تمام چیزوں کو انسان کی ضروریات کے لئے بنایا ہے اور انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ ہر علم میں چھان بین کرے۔ مشاہدات پر فکر کرے اور تاریخ کائنات پر غور کرے۔

"کیا دیکھتے نہیں کہ حیوانات ہم نے پیدا کئے لیکن ان کے مالک انسان بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے ہاتھی، گائے اونٹ اور گھوڑے جیسے جانوروں کو ان کا یوں مطیع کر دیا کہ وہ ان پر سوار ہوتے ہیں اور انھیں کھاتے بھی ہیں۔ ان کے بالوں۔ چمڑوں۔ ہڈیوں اور گوبر وغیرہ میں ان کے لئے کس قدر فوائد ہیں اور پھر غور کریں کہ ہم خون سے کیوں اکر دودھ ان کے لئے مہیا کرتے ہیں۔ کیا وہ اب بھی شکر گزار نہ ہوں گے؟" ٥ (یٰسین۔ ۷۲)

قرآن کی تلقین ہے کہ اگر حقیقت معلوم کرنا ہو تو چاند، سورج اور دوسرے مظاہر قدرت کو دیکھو ایک مسلم کا فرض ہے کہ وہ ان نشانیوں پر غور کرے اور ان کے پاس سے اس طرح نہ گزر جائے کہ وہ بہرا اور اندھا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے　　مومن کی ہے پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

انہیں مشاہدات سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ یہیں سے جدید سائنس کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور یہی تمام موجودہ علوم و فنون کا بنیادی اصول ہے۔ اگر اسلام نے تجربہ اور مشاہدہ کے اس اصول کو پیش نہ کیا ہوتا تو دنیا ابھی تک افلاطون اور ارسطو کی غلامی میں چکر کھاتی رہتی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس چراغ سے مغرب روشن ہے۔ اس میں ہمارے ہی تمدن کا تیل جل رہا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں ہو گئی
اور دیا تہذیبِ مغرب کا فروزاں کر گئی

قبر اس تہذیب کی یہ سرزمین پاک ہے
جس سے تاکِ گلشن یورپ کی رگ نمناک ہے

ایک عرصہ تک غلط طور پر یہ تسلیم کیا جاتا رہا کہ سائنس میں تجربہ اور مشاہدہ کے طریقہ کو یورپ والوں نے اور خاص کر راجر بیکن نے دریافت کیا۔ حالانکہ خود بیکن کی سائنٹفک تعلیم اندلس کی مسلم جامعات میں ہوئی اور اس پر ابن الہشیم کا بہت گہرا اثر تھا چنانچہ بیکن نے اس کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ اور برفو نے اپنی کتاب Making of humanity میں اس نکتہ کو وضاحت سے بیان کیا ہے برفو لکھتا ہے۔

"راجر بیکن نے آکسفورڈ میں عربی زبان اور عربی سائنس کی تعلیم حاصل کی۔ سائنس میں تجربی طریقہ کو داخل کرنے کا سہرا نہ تو راجر بیکن کے اور نہ اس کے ہمنام فرانسیس بیکن کے سر ہے۔ راجر بیکن کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ عیسائی یورپ میں مسلم سائنس اور طریقہ کا حواری ہے اور وہ یہ کہنے سے کبھی نہیں نکلتا کہ عربی زبان اور عربی سائنس سے واقفیت اس کے معاصرین کے لئے حقیقی علم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھی یہ بحث کہ عربی طریقہ کا موجد کون تھا۔ یورپی تمدن کی ابتدا کے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے کی کوششوں کا ایک جزو ہے۔ بیکن کے زمانہ تک عربوں کا تجربی طریقہ یورپ میں عام طور پر پھیل چکا تھا۔ اور بڑے شوق سے سیکھا جاتا تھا۔" (صفحہ ۳۵۵)

دوسری جگہ یہی مصنف لکھتا ہے۔

"عرب تمدن نے موجودہ دنیا کو جو اہم ترین عطیہ دیا ہے وہ سائنس ہے۔ لیکن یہ صرف سائنس ہی نہیں تھی جس نے یورپ کے مردہ قالب میں دوبارہ جان ڈالی۔ اسلامی تمدن کے دوسرے اور متعدد اثرات نے یورپی زندگی میں روشنی پیدا کی۔" (صفحہ ۴۵۴)

ایک اور جگہ رقمطراز ہے۔

"اگرچہ یورپی ارتقا کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اسلامی تہذیب کا فیصلہ کن اثر نہ پایا جاتا ہو کہیں اس کا سب سے زیادہ واضح اور سب سے زیادہ اہم اثر اس شعبہ پر پڑا ہے جو موجودہ دنیا کا امتیازی شعبہ ہے اور جس میں ہماری ساری طاقت کا زور مضمر ہے یعنی سائنس اور سائنٹیفک ذہنیت۔ عربوں کی سائنس کا احسان ہماری سائنس پر محض اس قدر نہیں ہے کہ اُنھوں نے چند عجیب و غریب انکشاف کئے ہوں یا چند انقلاب انگیز نظریے پیش کئے ہوں۔ ہماری سائنس عرب تہذیب کی کہیں زیادہ ممنون ہے۔ یعنی سائنس کا وجود ہی عربوں کی بدولت ہے۔ جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں وہ یورپ میں ایک نئی ذہنیت کے تحت پیدا ہوئی۔ یہ ذہنیت تحقیق و تجسس کے نئے طریقوں یعنی تجربوں، مشاہدوں، پیمائش اور علمِ ریاضی کے اُن نئے طریقوں پر مبنی تھی جن سے یونانی بالکل ناواقف تھے۔ اس ذہنیت اور ان طریقوں کو یورپ میں عربوں نے رائج کیا۔" (صفحہ ۱۹۰)

ان حقائق کے پیش نظر دنیا کو مسلمان کے بارے میں کہنا پڑ گیا کہ۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مولانا روم نے مثنوی میں عالمگیر تجاذب کی تشریح میں اشعار کہے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے۔

"اس کائنات کا ہر ذرّہ ہر دوسرے ذرہ کو اس طرح
کھینچتا ہے جیسے کہربا پتھر گھاس کے تنکوں کو کھینچتا ہے
ہے۔ آسمان اور زمین دونوں باہم لوہے اور مقناطیس
کی طرح ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔"

یہ مثنوی بارھویں صدی ۶ میں لکھی گئی ہے اور یورپ کا دعویٰ ہے کہ اس حقیقت کا انکشاف نیوٹن نے کیا حالانکہ نیوٹن کا زمانہ پانچ سو سال بعد کا ہے۔ علم ریاضی کے متعلق بھی عرب پیش پیش ہیں صفر کا استعمال سب سے پہلے محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے کیا ہے۔ اس کا زمانہ نویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ الجبرا کا موجد بھی خوارزمی ہی ہے۔ اور اسے ترقی دینے والوں میں ابوالوفا۔ الکوہی۔ ابوالجود۔ محمد ابن الیث ابومحمود الخوجندی۔ ابوبکر۔ محمد ابن الحسین الکرمی مشہور ہیں۔ عمر خیام نیشاپوری۔ ملک شاہ سلجوقی کا خاص ماہر فلکیات تھا۔ حضرت علامہؒ نے مسلمان کی تعریف ایک شعر میں کی ہے ؎

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

گوشے

زندگی کی وہ منزل جس میں انسانی شعور غیر پختہ ہوتا ہے زندگی کی آئینہ دار نہیں ہوتی۔ قرآن کریم کے نزدیک یہ زندگی اصل

معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق ہی نہیں۔

"یہ زندگی تو محض کھیلنے کودنے کی زندگی ہے۔ بچپن کا زمانہ ہے۔ زندگی تو درحقیقت اس کے بعد کی منزل ہے۔"

(۲۹/۶۴)

علامہؒ اقبالؒ نے بھی اس دَور کو سطحی تجسس کا دور کہا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تکتے رہنا ہائے وہ پہروں تلک سوئے قمر
وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اُس کا سفر
پوچھنا رہ رہ کے اس کے کوہ و صحرا کی خبر
اور وہ حیرت دروغِ مصلحت آمیز پر
آنکھ وقفِ دید تھی لب مائلِ گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

قرآن نے اس زندگی کو دیباچہ کہا ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ۔

"یہ موجودہ زندگی تو محض دیباچہ ہے اصل کتاب تو ابھی شروع ہونے والی ہے۔"

علامہ نے فرمایا ہے۔

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است
جہاں دیباچہ افسانہ ما!

ارتقا کے ضمن میں قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اللہ ایک تدبیر کرتا ہے پھر اُسے تکمیل تک پہنچانے کے لئے مختلف مراحل کراتا ہے۔ ایک ایک منزل کا نام یوم ہے۔ قوموں کی زندگی میں یہ دن گردش لیل و نہار کا نام نہیں بلکہ ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

"وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیر امور کرتا ہے پھر وہ امر (پختگی اختیار کرکے) اس کی بلند ہوتا ہے۔ ایک دن میں جس کی مقدار انسانوں کے تعداد و شمار کے لحاظ سے ہزار سال ہو سکتی ہے۔" ۳۲/۵

علامہ کا یہ ارشاد کہ زندگی کو پختگی تک پہنچنے کے لئے بے شمار منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

پروانے کی زندگی کے بارے میں ارشاد ہے۔

سیماب وار رکھتی ہے تیری ادا اسے
آدابِ عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے

علامہ کے نزدیک شعلہ کی شکست اور پرواز کی راکھ اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ خاکستر بن کر رہ جائے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ۔ چمک۔ حرارت پیدا ہو جائے۔ انسانی ہیولیٰ میں ہر چند نورانیت کا عنصر موجود ہے۔ لیکن ابھی مادیت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ اس لئے حقائق پر ظلمتوں کے پردے پڑے

رہتے ہیں۔ اس کی شکست اس لئے ہو گی۔ اس کے بعد شعلہ کی حرارتیں سمٹ کر شرر بن جائیں اور وہ اس آتشدانِ خاکی سے اُڑ کر فضائے نور کی ان وسعتوں میں جا پہنچے۔ جن کے لئے شرق و غرب کی قیود نہیں ہے۔ جو جگہ یعنی حکایت کے تصور سے باہر نہیں۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ملائکہ نہایت آسودگی کی حالت میں وفات
دیتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم پر سلامتی ہو۔ آیئے جنت میں داخل
ہو جایئے بوجہ ان اعمال کے جو تم نے کئے ہیں" (۱۶/۳۲)

یہی وہ نور ہے حیات ہے زندگی ہے شرر ہے جس کے سامنے موت عاجز ہے۔ موت عناصر کو منتشر کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ مگر زندگی کو نہیں۔
علامہ نے قضا کی بے بسی کا نقشہ کھینچا ہے۔

اڑاتی ہوں میں رختِ ہستی کے پرزے
بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا
مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی
وہ آتش ہے میں سامنے اسکے پارا
شرر بنکے رہتی ہے انساں کے دل میں
وہ ہے نورِ مطلق کی آنکھوں کا تارا

زندگی کا تسلسل کہیں ختم نہیں ہوتا البتہ کچھ مقامات ایسے آتے ہیں۔ جہاں ذرا دم لینا مقصود ہوتا ہے۔ اس سے اس کے تسلسل میں فرق نہیں آتا۔ قرآن میں ہے۔ جب نفوس کو پھر سے اٹھایا جائے گا تو خاک انہی پریشانی کے بعد

پھر "دل" بن جائے گی۔ علامہ فرماتے ہیں۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو اب مشکل ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

عمل صالح سے یہ جنت سے نکلا ہوا (گرا ہوا) آدم انسانیت کی معراج کو پہنچکر فرشتوں کی نظر میں قابلِ رشک بن جاتا ہے۔ جب اسے دوبارہ جنت میں داخل کیا جاتا ہے۔ تو فرشتوں کے دعوے غلط ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ آدمِ خاکی کے استقبال کا اہتمام دیکھ کر سہم جاتے ہیں کہ ہم نے کیا دلیل پیش کی تھی اور نتیجہ کیا بر آمد ہوا ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

قرآن کریم میں ہے۔

"بے شک ہم نے انسان کو بہترین ہئیت میں پیدا کیا پھر اسے اس کے اعمال کی بدولت نچلے سے نچلے درجہ میں لوٹا دیا۔ مگر سوائے ان کے جنھوں نے ایمان کے ساتھ اعمال صالح کئے پھر ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے"۔

(والتین ۴)

یورپ کے مادہ پرست انسان کی پرواز اس دنیا تک یا زیادہ سے زیادہ کسی قریبی ستارہ تک محدود ہے۔ جو صرف اسی زندگی سے متعلق ہے۔ لیکن مردِ مومن بہت بلند ہے۔

قسمت بادہ مگر حق ہے اس ملت کا انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخاب حیات

حقیقت یہ ہے کہ قوم کی تقدیریں ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ ان کے قلب و دماغ کی صلاحتیں۔ ان کے خونِ گرم کی حرارتیں۔ ان کا زورِ بازو۔ ان کا جوش کردار۔ امڈتے ہوئے سیلاب کی طرح ابھرتا ہے اور راستے کی ہر ٹکرانے والی قوت کو اپنے ساتھ بہا کرلے جاتا ہے۔

عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید۔ نومیدی۔ زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

وہ راہ نمایانِ ملت سے کہتے ہیں کہ قوم کے یہ توانا دل و دماغ جن کا ضمیر ہنوز آب و گل میں ہے۔ انکی صحیح نشوونما اور صالح تعلیم و تربیت کی فکر کیجئے کہ اگر یہ موزوں قالب میں ڈھل گئے تو قوم کی قوم سنبھل جائے گی۔ اور اگر یہی غلط رائے پر چل نکلے تو ساحلِ امید کشتی ملت کے پہنچنے کی توقع نہیں ہے۔

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقاہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوا ہائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی۔ خود نگری کا

نہ ٹھہرنا۔ اور چلتے ہی جانا ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

قرآن کے نزدیک جنت بھی آخری مقام نہیں ہے۔ بلکہ ایک راستہ آگے جانے کے لئے۔

"جنت میں پہنچ کر بھی ان کے ایک پسندیدہ راستہ کی طرف رہنمائی کی جائے گی۔" (۲۲/۲۴)

ثابت ہوا جنت مقام نہیں رہ گذر ہے انسان کو اس سے بھی آگے بڑھ جانا ہے۔ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے مسلمانانِ ہند کو احساسِ زیاں بخشا اور جس صور اسرافیل سے کام لیا۔ محشرستانِ ہند کا ذرہ ذرہ شاہد ہے اور نوجوانانِ ملت کے قلب و دماغ کی صحیح تخلیق و تعمیر میں بھی انتہائی جگر کادی و جانفشانی سے کام لیا۔ یہی وہ طبقہ تھا جسے انہوں نے اپنے تصورات کی آماجگاہ اپنی امیدوں کا مرکز۔ اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی لئے اپنے پیغاماتِ خصوصی کا درخورِ تخاطب سمجھا ہے۔ اپنے نوجوانوں کے لئے وہ دعائیں مانگتے تھے۔

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور انہی کو اپنے سوز و درد۔ اپنی تپش و خلش۔ تڑپ و اضطراب کا وارث سمجھتے تھے۔ بحضورِ حق ملتجی ہوتے۔

تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
میرا عشق میری نظر بخش دے

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

اُمنگیں میری آرزوئیں میری
امیدیں میری جستجوئیں میری

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

میرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

اس واسطے کہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ قوموں کی تعمیر و تخریب میں نوجوان کا کتنا عظیم الشان حصہ ہوتا ہے۔ تاریخ کے اوراق۔ حضرتِ انسان کے مشاہدات اور قرآن کے حقائق نے انہیں یقین دلایا تھا۔

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

علامہ اقبال مغرب کے مادہ پرست تخیل کو معراجِ انسانیت کی راہوں سے آگاہ فرماتے ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اس روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں

اللہ تعالےٰ نے صاف طور پر واضح فرمایا ہے۔ یہ بلندیاں جنھیں سموات کہا گیا ہے آبادی سے خالی نہیں ہیں۔

"اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اتنے زمین و آسمان پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا اور دونوں میں جو جاندار پھیلا دے وہ بھی" (۴۲/۲۹)

اقبالؒ نے ان آبادیوں کو کارواں کہا ہے ؎

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

زندگی ایک مسلسل خرام کا نام ہے۔ چلتے جانا۔ کہیں نہ رکنا۔ بڑھتے جانا کہیں

تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کی دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

حضرت علامہؒ کے نزدیک نوجوانوں کی "پریشاں نظری" ان کی غلط تعلیم کا نتیجہ تھی جس سے ان کے دماغ دولتِ یقین سے تہی مایہ۔ ان کی نگاہیں نورِ بصیرت سے محروم۔ ان کے بازو قوتِ عمل سے عاری اور دل تخلیق مقاصد کے جوہر گرانمایہ سے خالی ہیں۔ نہ ان میں کشمکشِ حیات میں عزم و استقلال سے کام لینے کی صلاحیت ہوئی ہے نہ حقائق کو سمجھنے کی توفیق۔ اسی لئے تو کسی حادثہ طوفان کی دعا مانگی گئی۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

کون و مکاں

یہ اعلان کہ جو کچھ ہے اُسے انسان کے تابع فرمان دکھایا گیا ہے صرف قرآن ہی میں ملے گا۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا ۝

"جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے۔ جو کچھ ان پستیوں اور بلندیوں میں ہے سب کچھ تمہارے تابع فرمان کر رکھا ہے۔"

حکیم اُمت حضرت اقبالؒ ان فقیہِ دین اور علماء کرام سے اس استفسار میں بحث نہیں کرتے کہ عالم وجود سے پہلے انسان کس عالم میں تھا؟ اس لئے کہ اِس

زندگی سے اس زندگی کا کوئی تعلق نہیں ہے وہ زندگی تھی اس نہ ختم ہونے والی زندگی کی خاطر۔ جب نہ ختم ہونے والی زندگی کا آغاز ہو گیا تو سابقہ سلسلہ ازخود ختم ہو گیا جس کے کریدنے سے کوئی گوہر مقصود ہاتھ نہیں آسکتا۔ چنانچہ انسان کو حال اور مستقبل پر غور و فکر چاہیئے۔ اس لئے کہ ہماری آج کی دنیا پر اُس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اِس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

اس کائنات میں انسان کا رُتبہ کس قدر بلند ہے۔ اور اس کی پوزیشن کس قدر قابلِ احترام ہے۔ اسی پوزیشن کا نام خودی ہے جسے سمجھنے کے لئے دنیا اب تک سر پٹک رہی ہے۔ انسان کی فضیلت کے متعلق پہلے پارہ میں ارشاد ہے کہ۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً

"میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"

فرشتے اِس ارشادِ الٰہی سے انگشت بہ دنداں ہو جاتے ہیں اور اس آب دگل میں کچھ خون کے چھینٹے اور کچھ آگ کی چنگاریاں دیکھ کر کہتے ہیں کہ اے بارالٰہ! یہ فتنۂ ارض اس عزت کے قابل نظر نہیں آتا اِس اعزاز کے مستحق تو کچھ ہم ہی ہیں۔ کہ

نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ

"ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں اور ہم تیرے ہی حکم کے مطابق کام کرتے ہیں"

خلاقِ فطرت کے چہرے پر تبسم نے گلفشانی کی اور فرمایا کہ۔

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ مضمون موزوں ہو کر کیا بننے والا ہے۔"

پھر اللہ نے عظمتِ آدم کی ایک جھلک دکھائی اور پوچھا کہ اب بتاؤ تم اس کے متعلق کس قدر صحیح جانتے ہو؟ جواب میں عرض کیا کہ بس اُسی قدر جس حد تک ہمیں علم دیا گیا ہے۔ پھر پوچھا کہ کیا یہ امینِ راز اس قابل ہے کہ نہیں کہ تم اس کے سامنے جھک جاؤ۔ اس پر بلا تامل کہا کہ سوائے اعترافِ حقیقت کے چارہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ جھکے اور بار بار جھکے کیونکہ اسی مجموعۂ اسرار کی خاطر ہر شے کو زیبائش دی گئی تھی۔ علامہ فرماتے ہیں۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

دوسرے معنوں میں نظامِ فطرت کی ہر چیز محض اس خاطر وجود میں لائی گئی ہے کہ انسان اس پر غالب آ کر اس پر حکومت کرے نہ کہ مغلوب ہو کر اس کی اطاعت قبول کر لے۔

یہ تمام اشیاء انسان کی ضروریاتِ زندگی کے لئے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان پیاسا ہے اور دنیا سے پانی کا وجود اُٹھا دیا گیا ہے اب یہ انسان مارے پیاس کے تڑپ تڑپ کر مر جائے گا لیکن اس کے برعکس پانی کا وجود قائم ہے لیکن روئے زمین پر انسان نہیں ہے تو کیا پانی اس غم میں مر جائے گا کہ

اسے استعمال کرنے والا کوئی نہیں رہا ؟ نہیں ۔ اس کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی ۔ لیکن محض ایک انسان کے گھر جنم لے لینے سے ان چیزوں کا مختار نہیں بنا جا سکتا بلکہ حاکمیت کا مقام حاصل کرنے کے لئے یقین محکم اور عمل پیہم کی ضرورت ہے ۔ جب یہ چیز کسی قوم میں آجائے تو وہ قوم اللہ کا لشکر یا جماعت بن جاتی ہے ۔ لیکن افسوس کہ آج مسلمان نے حکومت چھوڑ کر محکومیت اختیار کر رکھی ہے ۔ اسی کو خدا نے ذلت کہا ہے اور یہ عذاب ہے جو اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے بُلایا جاتا ہے ۔ علامہ نے بھٹکے ہوئے انسان کو مخاطب کیا ہے ۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

حوالہ قرآن ۔ مت گھبراؤ ۔ مت خوف کھاؤ ۔ تم تو دنیا میں سب سے بلند ہو بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ ۔" (۳/۱۳۸)

اسی حقیقت کی دوسری جگہ ترجمانی فرمائی ہے ۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

حوالہ قرآن۔ "اور اس طرح ہم نے تمھیں ایک بہترین قوم بنایا کہ تم تمام نوعِ انسانی کے (اعمال کے) نگراں رہو۔ اور تمھارے (اعمال کے) نگراں رسول ہیں۔" ($\frac{۲}{۱۴۲}$)

مومن کے مقام کا اب صحیح پتہ چلا کہ اس کا فرض کیا ہے کہ یہ تمام دنیا کی قوموں کے اعمال کا جائزہ لیتا رہے کہ کون ٹھیک کام کر رہا ہے اور کون راستہ سے ہٹ گیا ہے۔ کیونکہ اسے تمام کائنات کا نگراں بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یعنی ع

جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

جب اللہ تعالیٰ خلاقِ کائنات خود اس آدم (مومن) کی فضیلت کی شہادت دے تو پھر دنیا کی حکومت و ثروت کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے! یہ تو بنی ہی اس کے لئے ہے۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

بعض حضرات اور بالخصوص ہمارا مولوی طبقہ صاحبِ لولاک سے مراد صرف

وجودِ اقدس و اعظم حضرت محمدؐ لیتے ہیں۔ کیونکہ وہی ایمان وعمل کے مظہر اتم تھے لیکن شاید اللہ کا یہ ارشاد ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ
الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ۔ (۲۱/۱۰۵)

"اور یقیناً ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھدیا ہے کہ بے
شک یہ تمام زمین ہمارے صالح بندوں کی میراث ہے۔

گویا ہر مومن بطور حق کے اس پر قابض ہوگا اور کوئی اسے اس سے چھین نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ وراثت اسے اس مومن اعلیٰؐ سے منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔
یہ قطرہ ہے لیکن از خود ایک سمندر بھی ہے۔

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اِک بوند پانی میں بند

اور اس کی مثال اس گہرے کنویں کی ہے جس کی گہرائی میں آسمان ایک تارا نظر آتا ہے۔

خودی کا نشیمن تیرے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اور پھر اس خودی کی حفاظت بڑی ضروری ہے۔ ضروریاتِ زندگی کے سودے میں اسے فروخت کر دینا ہی غیر اسلامی طریق حیات ہے۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب
وہ ناں جس سے ہوتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

اس کے بعد اقبالؒ مردِ مومن کو عروج کی راہیں دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تیری آگ اِس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر!

پھر ارشادِ الٰہی کی تفسیر کرتے ہیں۔

خودی شیر مولا جہاں اسکا صید
زمیں اسکی صید آسماں اسکا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

اور یہ تمام فضائیں جو نگاہ میں ہیں یا فکر میں ہیں یا فکر میں مستور ہیں صرف انسان کے تابعِ فرمان ہیں۔

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تیری شوخیٔ فکر و کردار کا!
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

جب یہ مومن اللہ کی زبان اور فطرت کا ترجمان بن جاتا ہے اور پھر اللہ خود ان بندوں سے ان کی رضا پوچھتا ہے۔ اور پھر یہ بھٹکی ہوئی کائنات اس کے ایک ایک پیغام میں راحت و سکونِ حیات پاتی ہے۔ اس لئے تو علامہ نے مسلمان کو اس بات پہ زور دیا ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی متاع حیات حاصل کر کے پھر اپنے مقام پر آجا۔

سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید تیرے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تیری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

یہ مقام اس وقت حاصل ہو گا جب مسلمان پہلے اپنے چراغ روشن کر کے اندھیرے کو دور کر دیں۔ اس کے بعد اس کائنات میں اپنا قانون نافذ کر سکیں گے۔ پھر یہ کائنات ڈھل کر دلہن بن جائے گی۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

یہ امر مسلمہ ہے اور قرآن کا اٹل فیصلہ کہ بغیر قوت کے قانون نافذ نہیں ہو سکتے لیکن قوت کو وجود میں لانے کے لئے اسباب و علل کا وجود لازمی ہے۔ یہ قوت حکومت کے بعد وجود میں نہیں آتی بلکہ اس قوت کے بعد حکومت وجود میں آتی ہے۔ اور یہ قوت ہمیشہ افلاس میں پرورش پاتی ہے۔ کسی شے

کے نہ ہونے کا نام افلاس ہے آج ہمارے پاس ایمان نہیں ہے ہم مفلس ہیں۔ ہمارا مرکز نہیں ہے ہم مفلس ہیں۔ ہمارا قانون نہیں ہے ہم مفلس ہیں اور جب یہ چیزیں آجائیں افلاس چلا جاتا ہے۔ اور یہ چیزیں آتی ہیں احساسِ افلاس سے اس لئے تو علامہ نے فرمایا کہ :-

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

جس نے اِس احساس سے اپنی پوزیشن کا جائزہ نہیں لیا وہ ذلت کی زندگی میں ہے دنیا کبھی اُسے عزت نہیں دے سکتی۔

زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگیں
جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں

کلام و کلیم انسان کا وہ کلام خواہ وہ شاعری ہو یا نغمہِ دل جس سے سرد رگوں میں زندگی اور غیرتِ زندگی کی حرارت پیدا ہو جائے نہایت محترم ہے۔ اور ایسا کلام جو محض ذہنی عیاشی کا محور ہو قوتوں کے لئے زہر ہے۔ اگر یہی زہر خودی کے پانی میں بجھا ہوا ہو تو تریاق بن جاتا ہے۔ جیسا کہ علامہ فرماتے ہیں۔

واقف ہو اگر لذتِ بیداریِ شب سے
اُونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پُراسرار

قرآن کریم میں اگرچہ شاعری یا شعریت کا تمام فن موجود ہے۔ لیکن ربِ کائنات

نے لفظ شاعری کے پیشِ نظر کھلم کھلا اعلان فرمایا ہے کہ یہ کتاب اللہ ہے شاعری نہیں ہے۔ فرمایا۔

"اور ہم نے اس (رسول) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ اس کے شایانِ شان تھی بلکہ یہ تو ایک (حضرت کے بھلائے ہوئے سبق کی) یاد دہانی ہے اور کھلا کھلا قرآن (اور اس کا کام یہ ہے کہ) آگاہ کر دے اور نہ ماننے والوں پر (ان کی ہلاکت و بربادی سے پیشتر) اتمام حجت ہو جائے"۔ (۳۶/۶۹-۷۰)

اس سے ثابت ہوا کہ وہ کلام یا وہ گفتگو جس میں قانونِ فطرت سے الگ یا علاوہ ذاتی تخیلات اور فیصلے شامل ہوں قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اور اسی کلام کا نام شاعری ہے۔ جس میں مبالغہ یا دروغ کا امکان موجود ہو ورنہ وہ کلام کلامِ فطرت ہے۔

اقبال ؒ نے شعر کی حقیقت کو یوں بے نقاب کیا ہے۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخِ اُمم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

چونکہ شاعری میں دروغ کا امکان تھا اس لئے اللہ نے صاف صاف وضاحت فرما دی کہ شاعری پیغمبر کے شایانِ شان نہیں ہے۔ لیکن ایک رسول کا پیغام شعر کی تمام لطافتیں اپنے اندر رکھتے کس طرح شعر سے مختلف ہوتا ہے اس لئے کہ وہ پیغام جس کا سرچشمہ خدائے حی و قیوم کا علم ازلی ہوتا ہے اس کی امتیازی

خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قوموں کی مردہ رگوں اور خاموش روحوں میں خون زندگی دوڑا دے۔ مردوں کی بستی میں صور اسرافیل ہو کر رہے۔ یہی خصوصیت ہے جس کے لئے ارشاد ہے کہ:۔

"اے ماننے والو! اللہ اور اُس کے رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہا کرو جب وہ تمہیں اُس چیز کی طرف بُلاتا ہے۔ جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔" (۸/۲۴)

اسی دعوت۔ اسی بلاوے اور اسی آواز کے فراق میں تڑپ کر اقبالؒ نے کہا ہے کہ۔

کھل تو جاتا ہے مغنّی کے بم و زیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقام محمود
مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے
تو رہے اور ترا زمزمۂ لا محدود
جس کو مشروع سمجھتے ہیں فقیہانِ خودی
منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود

———

شعراور قرآن کے اس نمایاں فرق کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ
عام شاعروں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ۔

"وہ یوں ہی اِدھر اُدھر صحرانوردیاں اور دشت پیمائیاں کرتے پھرتے ہیں۔ اور اُن کے قول و فعل میں قلب و زبان میں کبھی ہم آہنگی نہیں ہوتی"۔

$\frac{۲۶}{۲۲۵-۲۲۶}$

فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ مسافر کو اُس راہ کی طرف لے جاتی ہے جو اُس نے اپنے لئے معیّن کر رکھی ہوتی ہے۔ جس کا کوئی منتہا ہو گا قدم اُسی سمت کی جانب اُٹھے گا اور جس کا کوئی مقصود نہ ہو گا کوئی منزل متعین نہ ہو گی وہ حیوانِ بے لگام کی مانند جدھر منہ اُٹھائے گا چل دے گا۔ یہ شاعر ایسا بھی کرتے ہیں کہ دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان سے کچھ اور ادا ہو رہا ہوتا ہے۔ یا کہنا کچھ چاہتے ہیں لیکن قیود و حدودِ شاعری میں مقید ہو کر نہیں کہہ سکتے اور فطرت کے خلاف کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کبھی حسین و جمیل وادی ہیں تو کبھی بھیانک صحرا ہیں۔ مقصد صرف پیشِ نظر گرمیِ سخن ہوتا ہے اور بس۔

اس کے برعکس ایک شخص کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد بھی اپنا متعیّن کردہ نہیں بلکہ وہ جو قرآن نے متعیّن کیا ہے جس پر اس کا ایمان ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے قلب و دماغ، اپنے افکار و جذبات کو اس کے تابع رکھے جس پر اُس

کا ایمان ہو۔ وہ سوچے تو اُس کے فہم سے۔ وہ سمجھے تو اُس کے اشارے سے۔ وہ دیکھے تو اُس کی آنکھ سے۔ وہ قبول کرے تو اُس کے حکم اور منشاء کے ماتحت۔ وہ رد کرے تو اُس کی مرضی کے مطابق۔ اب کوئی انسان اگر اپنے خیالات زبانِ شعر سے ادا کرے تو یہ شعرا اُس زُمرے میں آجائے گا جس کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ۔

"مگر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں۔ اعمالِ صالح کرتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اور اپنے آپ کی مدافعت اُس وقت کرتے ہیں جب اُن پر زیادتی کی گئی ہو۔" $(\frac{۲۶}{۲۲۷})$

اقبالؒ نے شعر کی شرح اس طرح کی ہے ؎

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرود
نہ میرا فکر ہے پیمانۂ ثواب و عذاب
خدا کرے کہ اسے اتفاق ہو مجھ سے
فقیہِ شہر کہ ہے محرمِ حدیث و کتاب
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

اقبالؒ بھی قرآن کی نگاہ میں اسی زُمرے میں شامل ہے کیونکہ وہ شعر اور قرآن فہمی کی جن بلندیوں پر پہنچ چکا تھا اُن کی رو سے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ عالمِ اسلام نے اس سے پہلے کبھی ایسا شاعر پیدا

نہیں کیا۔

اگر یہ درست ہے کہ کسی شاعر کے کلام کو سمجھنے سے پہلے اُس کے جذبات وخیالات تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے جن پر اس کی شاعری کی اساس ہے اور اس مرکز سے واقفیت حاصل کی جو اُس کی شاعری کا نقطہ پرکار ہے تو بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ کا کلام کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آسکتا جبتک قرآن کریم نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ جو اس نظر سے پیغامِ اقبالؒ کو دیکھے گا یا سُنے گا وہ جہاں ایک طرف یہ محسوس کرے گا کہ قرآن کریم انسان کو کن بلندیوں تک اُڑا کر لے جاتا ہے دوسری طرف یہ بھی دیکھ لے گا کہ اقبالؒ قرآنِ کریم کے اہم حقائق اور مسائل کو کس خوبی اور سلاست کے ساتھ ایک شعر میں حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں نے بھی ایک عرصہ تک اقبالؒ کو ایک شاعر کی حیثیت سے ہی دیکھا ہے۔ اُس پر تنقید کی ہے۔ اُسے غلط سمجھا ہے۔ اُس کی شاعری کو معیارِ شاعری پر پرکھنے کی سعی کی ہے۔ اور پھر کلام سے صرف شاعری کا لطف حاصل کیا ہے لیکن جب یہ حقیقت سامنے آگئی کہ کلامِ اقبال کا سرچشمہ کیا ہے تو اس کے بعد اُن کی شاعری کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اور پھر سمجھ میں آیا کہ اقبال کیا کہہ گئے ہیں۔ اور یہ راز بھی کھُل گیا کہ کون سی شاعری ہے جس کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ اس کا اتباع راہ گم کردہ لوگ ہی کرتے ہیں۔

"اور وہ کون سی شمع ہے جو اُس منزلِ مقصود کے لئے چراغِ راہ کا کام دیتی ہے۔ جس کی طرف صراطِ مستقیم

لے جاتا ہے۔" ۰ ۴۶/۲۲۴

علامہ اُس جذبات کے فوارہ کی طرف اشارہ فرما کر کہتے ہیں کہ ۔

یہ آبجو کی روانی یہ ہمکناریِ خاک
مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ
اِدھر نہ دیکھ اُدھر دیکھ اے جوانِ عزیز
بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوّارہ

اور پھر شاعر سے مخاطب ہوتے ہیں ۔

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نَے
شاعر! ترے سینہ میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیرِ غلامی میں خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اُس قوم کے حق میں عجمی لَے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مَے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کَے

اقبالؒ اُس پیغام کی تلاش میں سرگرداں ہے جسے حضرت بلالؓ کی روح نے سُنا اور اُس نوا کا منتظر ہے جو بلالؓ کی زبان سے نکلی اور پہاڑوں کا سینہ چیر گئی ۔ اقبال نے اپنی شاعری کو ذریعہ بنایا ہے

پیامِ الٰہی کے دُہرانے کا۔ اقبال کی شاعری بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے ورنہ اقبال عام شاعرے سے گریز کرتا ہے۔

ہے شعرِ عجم گرچہ طرب ناک و دلآویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مُرغِ سحر خیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز

اقبال فہمی اور قرآن فہمی کے اس اسلوب کی طرف میری رہ نمائی کرنے میں جن گرانمایہ ہستیوں کے بارِ احسان سے میری گردن ہمیشہ نگوں سار رہے گی اُن میں حضرت علامہؒ کی ذاتِ گرامی اور حضرت علامہ پرویز مصنفِ معارف القرآن کی محترم شخصیت ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے معارف القرآن کا مطالعہ یقیناً ہمیں اور ہماری نسلوں کو اسلام کی اُس زندگی میں داخل کر دے گا جس کے لئے علامہ بے قرار رہے اور جس کا مطالبہ خود قرآن نے کیا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے میں مشکل آگئی تو حضرت اقبالؒ کے ایک شعر نے رہ نمائی فرما دی اور مجھے اس کی تیز روشنی میں راستہ دکھائی دینے لگا۔ اس کے علاوہ میں نے "طلوعِ اسلام" کے سمندر سے چند قطرے لے کر تشنگیٔ ذوق کی تسکین کے سامان فراہم کئے

اور میں فخر کرتا ہوں کہ ایک چراغ ہے بلکہ سرچ لائٹ جس کی روشنی میں بھولے بھٹکے راستہ حاصل کرتے ہیں۔ طلوعِ اسلام اور اقبال کا مسلک ایک ہے۔ حضرت اقبال نے مذہب کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کی روح پھر سے ان کے خون کے ذرّوں میں جذب ہو گئی۔ اور اس طرح وہ غیر محسوس طور پر قرآنِ کریم کے قریب لا کر کھڑے کر دیے گئے۔ ہمارا وہ طبقہ جو مذہب سے متنفر ہو چکا تھا کلامِ اقبال کے عشق سے وہ پھر مجذوب ہو گیا ہے۔ اُس کا ذوق پھر غور و فکر کی طرف مائل کر رہا ہے۔

اس قدر کام تو حضرت علامہؒ نے سرانجام دیا کہ وہ نوجوان طبقہ کو غیر محسوس طور پر اور مولوی کے خشک انداز سے الگ اسلوب میں قرآن کریم کے بہت قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ اب یہ کام باقی ہے کہ انھیں یہ بتایا جائے کہ حضرت علامہ نے جو کچھ کہا ہے وہ قرآن کریم ہی کی ترجمانی ہے جُز اُس کے جو صرف انسانی تقاضوں کے ماتحت صرف شاعری ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر میں نے اللہ کے تعاونِ مخفی کو پکارا۔ اور اُس کا سہارا لے کر یہ کتاب شروع کی۔ اس کے بعد جو اللہ کو منظور۔ میں نے اُس ہنر سے گریز کیا ہے جس کے متعلق علامہؒ نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

نجات دنیا کے دیگر مذاہب کا منتہائے فکر یہ ہے کہ انسان کو اس کی اپنی نجات کا طریقہ سکھائیں۔ اُسے بتائیں کہ اُسے مکتی کیسے مل سکتی ہے اور وہ سیلویشن کس طرح حاصل کر سکتا ہے۔ اُسے سکھایا جاتا ہے کہ انسان دنیا کے دھندوں سے الگ ہو کر گاؤ۔ خدا۔ یا ایشور کی بھگتی کرے یا عبادت میں مگن ہو جائے۔ ان مذاہب میں خدا کے قریب وہی سمجھا جاتا ہے جو اُس کے بندوں سے دور ہوتا چلا جائے۔ گرہست آشرم اور سنیاس آشرم ایک انسان کی دو مختلف زندگیوں کے نام ہیں جو کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ کلیسا کا راہب بیوی بچوں کی زندگی سے دور بھاگتا ہے کہ ان میں اسے شیطان کی رُوح نظر آتی ہے۔ سلطنت اور مذہب نظامِ عالم کے دو جداگانہ شعبے ہیں۔ جن میں کبھی تطابق و توافق پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے برعکس اسلام دنیا کو ایک اور ہی سبق دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ مذہب انسان کی عملی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ اس کے حدود و قیود وہ پختہ ساحل ہیں جو حیاتِ انسانی کی جوئے رواں کا رخ متعین کرتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک مذہب کا منشا محض ایک انسان کی انفرادی نجات ہی نہیں بلکہ اس مقصد یہ ہے کہ خدا کی اس وسیع زمین پر جسے انسان کی ہوس پرستیوں نے جہنم بنا رکھا ہے۔ اللہ کی حکومت قائم کی جائے۔ اس نظامِ زندگی اور ضابطہ حیات کا نام اسلام ہے۔

پھر ظاہر ہے کہ اس حکومتِ الٰہیہ کے قیام و بقا کے لئے اللہ کے سپاہیوں کی جماعت کی ضرورت پڑے گی۔ اس جماعت کا نام ہے "ملتِ اسلامیہ" جو دنیا میں اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے خدا کے لئے جیتی ہے۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

مگر ستم یہ ہوا کہ اسلام کی اس امتیازی تعلیم پر غیر اسلامی تصورات اس درجہ غالب آگئے کہ حیاتِ اجتماعیہ کا یہ نظریہ مسلمانوں کی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو گیا اور دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے متعلق بھی یہی سمجھ لیا گیا کہ اس کا مقصد انسان کی انفرادی نجات ہے۔ اگرچہ یہ عجمی نظریہ مسلمانوں کے ذہن پر ایک عرصہ سے مسلط تھا۔ لیکن دورِ حاضرہ میں ان لوگوں کی طرف سے جو یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ امتیازی نشان ہے۔ ان کے بعض مخصوص مقاصد کی راہ میں ایک سنگِ گراں بن کر حائل ہے۔ اس نظریہ کو بڑا نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے اور ہر جگہ اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ مذہب انسان کے پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے۔ عملی زندگی میں اس کا کوئی دخل اور اثر نہیں ہونا چاہئے۔ ایسے پُر آشوب زمانہ میں جبکہ مذہب کے متعلق اپنوں اور بیگانوں کی طرف سے اس قسم کے غیر اسلامی تصورات کو عام کیا جا رہا تھا۔ ملتِ اسلامیہ کی خوش بختی سے ان کے اندر ایک مردِ صاحبِ بصیرت پیدا ہوا۔ جس نے بصیرتِ قرآنی اور جذبِ ایمانی سے مسلمانوں کے سامنے ان کے اس گمگشتہ نظریہ پھر سے نمایاں کیا اور اعلان کیا کہ:۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مولویوں نے کہا کہ یہ غلط ہے بلکہ زوال کا سبب یہ ہے کہ ہم بے سرمایہ ہیں

پوری کی پوری قوم افلاس کے جامے میں پھنسی ہوئی ہے لیکن اس مردِ خدا نے کہا

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

جب تک طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم نہ بدلیں گے ہماری نگاہوں کے زاویے نہیں بدل سکتے علامہ نے بھی اسی حقیقت پر زور دیا ہے کہ :۔

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم

چونکہ انگریز نے ہمیں ہماری تعلیم سے بہت دور کر دیا اور حاکمانہ حیثیت سے اپنی تہذیب ہم پر ٹھونس دی جس کے قبول کر لینے پر ہم مجبور تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ہم خود سے بیگانہ ہو گئے۔ علامہ نے ملت کے نوجوان طبقہ کو اسی حالت میں دیکھ کر کہا۔

تیرا وجود سراپا تجلیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مغرب کے فلسفہ حکمت کی زد سے مشرق کا ذہن محفوظ نہ رہ سکا مغرب کا منتہائے مقصود یہ تھا کہ کسی طرح سے مسلمان "مسلم" نہ رہے اور اُس نے اپنی کامیابی کے لئے اسلامی درسگاہوں کے نظام و نصاب کو بدل دیا اور وہ واقعی کامیاب ہو گیا۔ اور ہمیں ایسا علم دیا جس سے شرافت کا علم ختم ہو گیا

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی !
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
زباں نے کہہ بھی دیا لاَ اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس تعلیم نے ہمیں منتشر کر دیا ہے وہ یکجہتی نہیں رہی۔ وہ رابطۂ ملّت نہیں وہ مرکزیت نہیں۔ فرد اور ملّت کی مثال ایک گھڑی کے پُرزوں کی سی ہے۔ پُرزے الگ الگ بکھرے پڑے ہوں تو ایک ایک پُرزہ کتنا ہی قیمتی اور کیسا ہی مضبوط کیوں نہ ہو کسی کام کا نہیں۔ لیکن اگر یہی پُرزے ایک خاص نظام کے ماتحت گھڑی کے اندر فِٹ کر دیے جائیں تو ہر پُرزہ کی حرکت ساری مشینری پر اثر کرے گی اور پُرزوں کی حرکات کے نتائج آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔ علامہ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ یہ پُرزے گئے تو اسلام بھی گیا۔

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بُو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملّت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

ان کے نزدیک مسلم کی تعریف ہی یہی ہے کہ وہ قطرہ کی طرح فنا ہو کر ملّت کے

سمندر میں جذب ہوجاتے اور یوں بقائے دوام کے بلند مقام پر سرفراز ہوجائے۔ علامہ اقبال اَنَا المِلّت کا نعرہ لگانا سکھاتے ہیں "نبی اکرم نے فرمایا کہ تمام روئے زمین کے مسلمانوں کی مثال ایک جسدِ واحد کی سی ہے" اگر تپتے ہوئے صحرا میں کسی حبشی کے تلوے میں آبلہ پڑجائے گل کدۂ ایران میں ریشمی بستر پر لیٹے ہوئے شہنشاہ کی نیند حرام ہوجائے۔ ایک ایک انسان اپنے آپ کو پوری کی پوری ملت سمجھے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے

"یقیناً ابراہیم (علیہ السلام) ایک فردِ واحد نہیں تھا بلکہ ایک (پوری کی پوری) ملتِ قائمہ کو اپنی ذات میں سموئے ہوئے تھا۔ اور تمام دنیا سے کٹ کر سیدھا اُسی کے راستہ پر قائم تھا۔"

علامہ اقبال ؒ فرماتے ہیں کہ:

بتانِ رنگ و بُو کو توڑ کر ملت میں گُم ہوجا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

وہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو نے اپنے مقام کو پہچانا ہی نہیں اور یونہی تہذیب مغرب کی جھوٹی چمک تجھے پسند آگئی حالانکہ اگر کبھی تو اپنے آپ سے آگاہ ہوجاتا تو محسوس کرلیتا کہ:

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

حضرت علیؑ کا قول ہے:

"ہمیشہ تفرقہ سے بچو۔ یاد رکھو کہ جو شخص ملّت سے کٹ کر تنہا رہ جاتا ہے وہ اسی طرح شیطان کا شکار ہو جاتا ہے جس طرح ایک بھیڑ گلّے سے جدا ہو کر بھیڑیے کا شکار ہو جاتی ہے۔ دیکھو جو شخص تمھیں اس شکار کی طرف دعوت دے اُس کو قتل کر ڈالو خواہ وہ سر میرے ہی عمامہ کے نیچے کیوں نہ ہو۔"

علّامہ فرماتے ہیں ؎

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو
اُخوت کا بیاں ہو جا محبّت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسل ہیں بال و پر تیرے
تو اے مُرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

نبی اکرمؐ نے فرمایا:

"ہمیشہ جماعت کے ساتھ رہو جو جماعت سے الگ ہوا سیدھا جہنّم میں گیا۔"

اور مزید فرمایا کہ:۔

"میں تمھیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم

دیا ہے۔ اوّل۔ جماعت کے ساتھ رہو۔ دوم۔ حکم امیر سنو
سوم۔ امیر کی اطاعت کرو۔ چہارم۔ ضرورت پڑے تو
اپنی عزیز ترین چیزوں کو حق کے لئے چھوڑ دو۔ پنجم۔ اللہ
کے راستے میں جہاد کے لئے نکل آؤ۔ یاد رکھو جو شخص جماعت
سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا تو اسلام کا نشان
اُس کے گلے سے اُتر گیا"۔

سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ۔ خواہ وہ روزے رکھتا ہو اور
نمازیں پڑھتا ہو؟ فرمایا ہاں وہ جماعت سے الگ ہو کر
اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

اس لئے کہ۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملت کے ساتھ واسطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

جب تک ہم دینِ مصطفوی کو از سرِ نو زندہ نہ کریں گے۔ اپنے بھولے ہوئے سبق کو نہ دہرائیں گے قرآنِ کریم کو مولوی اور انگریز کے نظریہ سے الگ ہو کر نگہِ محمدؐ سے نہ دیکھیں گے ہم اپنے آپ کو نہ پہچان سکیں گے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم

قرآن کو صرف اس لئے پڑھیں کہ وہ ہمیں زندگی بسر کرنے کے طریقے سکھاتا ہے۔ پھر وہ طریقے سیکھیں اور آہستہ آہستہ عمل کرتے جائیں اور غیروں کی تہذیب کو دفن کرتے چلے جائیں۔ ایک دن آئے گا کہ یہی سائنس ہمیں قرآن کے اندر نظر آئے گی صرف انکشاف کی ضرورت ہے۔ ہم سائنس کو علمِ قرآن کا جزو کہیں تو مناسب ہے۔ انگریز جس نے ہمیں قرآن سے ہٹا کر مادہ پرستی کی طرف مائل کیا خود پریشانیوں سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ اسی مشکل میں پھنسے ہوئے انگریز کے متعلق اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

علامہ اقبال نے مغرب کی انتہائے تہذیب کو لبِ گور کہا ہے اس لئے کہ جب باطل اپنے دعووں کی بنیادوں پر اس قدر اونچا چلا جاتا ہے جہاں پہنچ کر اور بلند ہونے کے لئے اُسے کچھ نہیں سوجھتا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تو وہ اپنے علم کو نہایت ہی کم اور کمزور محسوس کرتا ہے گویا ٹھیک اس وقت اس کا ضمیر دعووں کی تردید کرتا ہے اور ٹھیک اُس وقت اُس کے غلط دلائل کا جنازہ

اُٹھتا ہے اور اُس کے تصورات کی میت لبِ گور ہوتی ہے۔

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیّت کہ جو ہے خود لبِ گور

ایک حسین طنز ملاحظہ ہو:۔

نئی بجلی کہاں اُن بادلوں کے جیب و دامن میں
پُرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

قومیت کا مفہوم

دنیا میں قومیں اشتراکِ وطن۔ اشتراکِ نسل اور اشتراکِ زباں وغیرہ کی اساس پر مبنی ہیں۔ وہ پارٹیاں کہلاتی ہیں۔ مثلاً انگریزوں کی ایک قوم ہے جو اصول و مسلک کے اشتراک سے قائم نہیں ہوئی لیکن اس قوم کے اندر اشتراکِ اصول کے ماتحت لبرل اور لیبر وغیرہ پارٹیاں بنتی رہتی ہیں۔ اسلامی قومیّت میں وجہ جامعیت وطن۔ نسل۔ رنگ اور زبان وغیرہ نہیں۔ بلکہ اصول مسلک ہے یعنی وہ وجہ جامعیت جس کی بنا پر آج قومیں نہیں بلکہ پارٹیاں بنتی ہیں۔ اس لئے دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں اس اصولِ ترتیب کی جہت سے مسلمان حزب یعنی پارٹی ہیں۔ گویا اسلامی قومیت خاک و خون کی حدود سے بلند اصول و مسلک کے اشتراک کی بنا پر قائم ہوتی ہے۔ اشتراکِ وطن کے نظریہ کو بے نقاب کرتے ہوئے علامہؒ نے فرمایا ہے کہ۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

جن افراد میں اصول و مسلک کا اشتراک مشترک ہو وہ اس قوم کے افراد ہیں جو اس اصول سے مُنہ پھیر لیں وہ مردم شماری کے رجسٹر میں اپنا نام خواہ کچھ ہی کیوں نہ لکھوائیں مسلم قومیت کے افراد نہیں کہلا سکتے۔ حضرت علامہؒ نے مسلم قوم کے افراد کو مخاطب فرمایا ہے۔

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

ہماری آج کی زندگی قطعی اس قابل نہیں کہ ہم رات کو سوئیں اور صبح اُٹھیں تو ہم میں سے ہر ایک عمرِ فاروقؓ بنا ہوا ہو۔ چنانچہ ہمیں اسلامی زندگی اپنانے کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ لیکن اس درمیانی وقفہ میں اگر یہ صورت رہی کہ ہم جو قدم اُٹھائیں وہ اسلام کی طرف اُٹھائیں تو اُس مدت تک یہ جاہلیت کی منزل ختم ہو جائے گی اور اگر یہی فیصلہ کر کے بیٹھ جائیں کہ یہ کام ایک دن کا نہیں ہے اسے تو برسوں چاہئیں تو یاد رکھیئے وہ برسوں کے بعد کا دن آپ کی زندگی میں کبھی نہیں آئے گا اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ دن آپ کی زندگی میں آجائے یا کم از کم آپ کے بعد آپ کی نسلوں کی ابتدا اُس دن سے ہو تو فیصلہ کر لیجئے کہ ہم اپنے اندر ایک عادت ڈالیں گے کہ ہمارا جو قدم اُٹھے تہذیبِ اسلامی کی جانب اُٹھے۔ یہ ایک

ایک قدم پوری منزل کاٹ کر رکھ دے گا کیونکہ ہم تباہی کی طرف بھی اسی طرح اسی رفتار سے آئے تھے وہ راستہ بھی برسوں کے بعد ختم ہوا تھا۔ اب ہمیں دوسری منزل کی طرف قدم اُٹھانا ہے تو یہ راستہ بھی برسوں کی مسافت کے بعد طے ہوگا۔ سب سے پہلے ہمیں وطن کی حقیقت کو سمجھنا ہوگا۔ وہ اس لئے کہ اتفاق ہے یا بدقسمتی سے ہم آج ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں وطن کا بُت سب سے زیادہ عزیز نظر آرہا ہے۔ ہم ہجرت کر کے ترکِ وطن کر چکے ہیں اور ہم اُنہی اینٹ پتھر کی عمارتوں کو رو رہے ہیں اور اس زمین کو قطعی اجنبی خیال کرتے ہیں۔ حضرت اقبالؒ قرآن کی روشنی میں بتاتے ہیں کہ۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
وہ بحر میں آزاد وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سُنّتِ محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوّت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے

لفظ قوم اور اس کے ہم معنی انگریزی لفظ نیشن یہ دونوں دراصل جاہلیت کی اصطلاحیں ہیں۔ جاہلیت نے "قومیت" کو کبھی خالص تہذیبی بنیاد پر قائم نہیں کیا۔ قدیم جاہلت کے دور میں اور جدید جاہلیت کے دور میں ان کے دل ودماغ کے ریشوں میں نسلی اور روایتی علائق کی محبّت کچھ اس طرح پلادی گئی ہے

کہ وہ نسلی روابط اور تاریخی روایت کی وابستگی سے قومیت کے تصور کو کبھی پاک نہ کر سکے جس طرح قدیم عرب میں قوم کا لفظ عموماً ایک نسل یا ایک قبیلہ کے لوگوں پر بولا جاتا تھا اسی طرح آج بھی لفظ نیشن کے مفہوم میں مشترک جنسیت کا تصور لازمی طور پر شامل ہے اور یہ چیز چونکہ بنیادی طور پر اسلامی تصور اجتماع کے خلاف ہے اس وجہ سے قرآن میں لفظِ قوم اور اس کے ہم معنی دوسرے لفظ مثلاً شعب وغیرہ کو مسلمانوں کی جماعت کے لئے اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصطلاح اس جماعت کے لئے کیونکر استعمال کی جا سکتی تھی جس کے اجتماع کی اساس میں خاک و خون اور رنگ و نسل اور اس نوع کی دوسری چیزوں کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا جس کی تالیف و ترکیب محض اصول اور مسلک کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ اور جس کا آغاز ہی ہجرت اور قطع نسب اور ترک علائق مادی سے ہوا تھا۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اِس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اِس سے

قرآن نے جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کے لئے استعمال کیا ہے وہ حزب ہے جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔ قومیں نسب و نسل کی بنیاد پر استوار ہوتی ہیں

اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں جماعت ہیں۔ کیونکہ اُن کو تمام دنیا سے الگ اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اصول اور مسلک کے معتقد اور پیرو ہیں۔ اور جن سے ان کا اصول و مسلک میں اشتراک نہیں وہ خواہ ان سے قریب ترین مادی رشتے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں ان کے ساتھ ان کا کوئی میل نہیں ہے۔ قرآن روئے زمین کی اس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں دیکھتا ہے ایک اللہ کی جماعت (حزب اللہ) دوسری شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان) شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اصول اور مسلک کے اعتبار سے کتنے ہی اختلاف کیوں نہ ہوں قرآن ان سب کو ایک سمجھتا ہے کیونکہ ان کا طریق فکر اور طریق عمل بہرحال اسلام نہیں ہے اور جزئی اختلافات کے باوجود بہرحال وہ سب شیطان کے اتباع پر متفق ہیں۔ قرآن کہتا ہے۔

"شیطان ان پر غالب آگیا اور اس نے خدا سے انہیں
غافل کر دیا وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو
کہ شیطان کی پارٹی آخر کار نامراد رہنے والی ہے۔"

علامہ فرماتے ہیں :-

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

یعنی افراد اپنی جمعیت سے علیحدہ ہونے کے بعد دوسری یعنی شیطان کی پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے جو حزب اللہ نہیں ہے اسی لئے تاکید کی ہے کہ ؎

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

اللہ کی پارٹی والے خواہ نسل۔ وطن اور زبان اور تاریخی روایات کے اعتبار سے باہم کتنے ہی مختلف ہوں بلکہ چاہے ان کے آباؤ اجداد میں باہم خونی عداوتیں ہی کیوں نہ ہوں جب وہ خدا کے بتائے ہوئے طریق اور متعین کردہ اصول اور مسلک حیات میں متفق ہو گئے تو گویا الٰہی رشتے (حبل اللہ) سے باہم ایک ہو گئے اور اس نئی پارٹی (حزب اللہ) میں داخل ہوتے ہی ان کے تمام تعلقات حزب الشیطان والوں سے کٹ گئے۔

پارٹی کا یہ اختلاف باپ اور بیٹے تک کا تعلق توڑ دیتا ہے حتیٰ کہ بیٹا باپ کی وراثت تک نہیں پا سکتا۔ کیونکہ یہ دو مختلف ملتوں کے لوگ ہیں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

پارٹی کا یہ اختلاف بیوی کو شوہر سے جدا کر دیتا ہے حتیٰ کہ اختلاف رونما ہوتے ہی دونوں پر ایک دوسرے کی مواصلت حرام ہو جاتی ہے محض اس لئے کہ دونوں کی زندگی کے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ۔ "نہ وہ ان کے لئے حلال نہ یہ ان کے لئے حلال۔"

پارٹی کا یہ اختلاف ایک برادری ایک خاندان کے آدمیوں میں پورا معاشرتی مقاطعہ کرا دیتا ہے حتیٰ کہ ایک دوسرے میں شادی بیاہ کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ :۔

"مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو" "مومن لونڈی مشرک خاتون سے بہتر ہے۔ خواہ وہ تمھیں کتنی ہی پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح بھی مشرک مردوں سے نہ کرو۔ جب تک کہ دونوں ایمان نہ لائیں۔ مومن غلام۔ مشرک عزت دار سے بہتر ہے چاہے وہ تمھیں کتنا ہی پسند ہو"۔

پارٹی کا یہ اختلاف نسلی و وطنی قومیت کا تعلق صرف کاٹ ہی نہیں دیتا بلکہ دونوں میں ایک مستقل نزاع قائم کر دیتا ہے تا وقتیکہ وہ اللہ کی پارٹی کے اصول نہ مان لیں۔ قرآن کہتا ہے :۔

"تمھارے لئے بہترین نمونہ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے۔ ان لوگوں نے اپنی قوم والوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ ہمارا تم سے اور تمھارے ان معبودوں سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر بندگی کرتے ہو کوئی واسطہ نہیں۔ ہم تم سے بے تعلق ہو چکے اور ہمارے تمھارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت پڑ گئی تا وقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ مگر تمھارے ابراہیم کے اسی قول میں نمونہ نہیں ہے کہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میں تیرے لئے بخشش کی دعا

کروں گا۔" (سورۂ ممتحنہ۔ رکوع اوّل)

"لیکن جب ابراہیمؑ کو معلوم ہو گیا کہ اس کا باپ خدا کا پکا دشمن ہے تو وہ دعا کے لئے دست بردار ہو گیا۔" (سورہ توبہ رکوع ۱۴)

دوسرا لفظ جو پارٹی ہی کے معنی میں قرآن نے مسلمانوں کے لئے استعمال کیا ہے وہ لفظ "اُمت" ہے۔ اُمت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امرِ جامع نے مجتمع کیا ہو۔ افراد کے درمیان کی اصلِ مشترک ہونی چاہیے جس کی بنا پر انھیں ایک اُمت کہا جا سکے۔ مسلمانوں کو جس اصلِ مشترک کی بنا پر اُمت کہا گیا ہے وہ نسل وطن۔ رنگ۔ زبان یا معاشی اغراض نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ان کی زندگی کا نصب العین اور ان کی پارٹی کا اصول اور ان کی جماعت کا مسلک ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

"تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسانی کے لئے نکالا گیا ہے
تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان
رکھتے ہو۔" (سورۂ آل عمران۔ رکوع ۱۲)

اس سے ظاہر ہوا کہ مسلمان ایک بین الاقوامی جماعت کا نام ہے۔ دنیا کی ساری قوموں میں سے ان اشخاص کو چھانٹ کر نکالا گیا ہے جو ایک خاص مشن کو انجام دینے کے لئے زندہ ہوں۔ اللہ نے اس پارٹی کے متعلق کہا ہے کہ "تم نوعِ انسانی پر نگراں ہو۔" اس فقرہ سے ظاہر ہے کہ مسلمان کا مشن عالمگیر مشن ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اللہ کے قانون کو زمین کے چپہ چپہ پر نافذ کرے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر اسے اُمت کہا گیا ہے۔

لیکن رفتہ رفتہ اس حقیقت کو بھولتے چلے گئے کہ وہ دراصل ایک پارٹی

اور اسی اساس کی بنیاد پر ان کی قومیت کی بنیاد ہے یہ بھلا وا بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ پارٹی کا تصور قومیت کے تصور میں بالکل گم ہو گیا ہے مسلمان اب صرف ایک "قوم" بن کر رہ گئے ہیں جیسا کہ جرمن ایک قوم ہے۔ جاپان ایک قوم ہے۔ لیکن وہ بھول گئے ہیں کہ اصل چیز وہ مسلک ہے جس پر اسلام نے ان کو ایک امت بنایا تھا۔ افسوس کہ مسلمان نے دوسروں سے قومیت کا غلط تصور لے کر اصل چیز کو اپنے اندر سے ضائع کر دیا ہے۔

پارٹی سے انحراف کی سزا قتل ہے لیکن قوم سے انحراف کی سزا صرف علیحدگی ہے۔ کیا آج روئے زمین پر اسلامی سوسائٹی موجود ہے؟ ——— نہیں۔ پھر ہم کس بنا پر اپنے اندر اسلامی ہمدردی اور رواداری کو بیدار کر سکتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم سوسائٹی سے باہر ہو کر سوسائٹی کے افراد سے ہمدردی کا سلوک کریں۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ جب تک ہم ایک سوسائٹی بن نہیں آجاتے اخوت۔ رواداری۔ اور شرافتِ انسانی کے جوہر آبداری حاصل نہیں کر سکتے۔ مسلمان کا مفاد۔ مسلمان کی ترقی۔ مسلمان کی حکومت و ریاست مسلمان کی وزارت۔ مسلمان کی تنظیم اور ایسے ہی دوسرے الفاظ ان مواقع پر بول سکتے ہیں جب کہ یہ چیزیں اصول اسلامی کے تحت ہوں۔ ورنہ لفظِ مسلمان کا استعمال درست نہیں۔ ایسے شخص کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے جو اسلامی سوسائٹی کا فرد نہیں ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

غیروں سے دوستی

اللہ نے ایسے لوگوں کے لئے جو اپنی خوئے غلامی کو تقدس کا پیراہن دے کر اپنے خبث باطن مذہب کی آڑ میں چھپاتے ہیں اور یوں خدا اور اُس کے رسول ؐ اور اپنی جماعت کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں کھُلے کھُلے لفظوں میں فرما دیا ہے کہ :-

وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (۲/۹)

" وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ کیا کر رہے ہیں "

غیروں سے دوستی یا غلامی کی ابتدا میں وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم ملت کو دھوکے میں رکھنے میں کامیاب ہیں لیکن نہیں سمجھتے کہ اس کی انتہا میں وہ خود دھوکے میں ہیں - علامہ نے بھی اسی دوستی اور غلامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان لوگوں کو ان کی پوزیشن سے آگاہ کیا ہے - فرماتے ہیں -

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن !

یہ ہے وہ طبقہ جو ملت کے لئے ہمیشہ رہزنِ ایمان و حریت ثابت ہوتا ہے اور ان سے بچنا ہمیشہ متاعِ دین و تقویٰ کے تحفظ کا موجب - ان میں سے کچھ تو محض جہالت کی بنا پر ایسا مسلک اختیار کرتے ہیں لیکن کثر نفس پرستی کا شکار ہو کر ذاتی منفعت کی خاطر ایسا کرتے ہیں - یہی طبقہ تھا کہ جب اُس نے ملک میں انگریز کا غلبہ دیکھا تو کتاب و سنت کو اپنے جذباتِ رذیلہ کے ابلہ فریب غلافوں

میں لپیٹ کر آگے بڑھا اور کہیں حاکمِ وقت کی اطاعت کو فریضہ خداوندی قرار دیا، کہیں اسے سایۂ الٰہی ٹھہرا کر اس کی فرماں پذیری کو (نعوذ باللہ) خدا اور رسولؐ کی اتباع کا قائم مقام بتایا۔ کہیں اس کی خاطر جہاد بالسیف کو حرام قرار دیا۔ اور کہیں فسادِ ارض کی نصِ صریحہ سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا خیال تک لانا کفر کے مرادف بتایا۔ غرضیکہ یہ تھا وہ گروہِ حاملانِ دینِ متین اور مفتیانِ شرعِ متین جس نے اپنی نفس پرستی کی خاطر غیر خدا کی غلامی کی بدترین لعنت کو نعمتِ الٰہی بنا کر دکھایا اور یوں مذہب کی آڑ میں خواہشات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا۔ علامہؒ نے ان ہی مفتیانِ شرع کے متعلق فرمایا ہے کہ :۔

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے۔ نمناک نہیں ہے
کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

ان ملّاؤں کے برعکس جنہوں نے متاعِ دیں کو انگریز کے قدموں میں جھکا دیا تھا اپنے متعلق کہا کہ۔

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

اور ان مُفتیانِ شرعِ متین کو ان کا مقام دکھاتے ہوئے فرمایا

کہ سہ

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

انگریز کے عروج نے زوال کی سمت رُخ کیا ان کے تار و پود ٹوٹنے لگے اور ہندو کے عروج کا وقت پیدا ہوا حکومت آہستہ آہستہ برہمنوں کے ہاتھ میں منتقل ہوتی چلی گئی۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی اس غلام فطرت۔ نفس پرست طبقہ نے بھی اپنے مسجدوں کی سمت میں تبدیلی پیدا کرنا شروع کی۔ اب انہوں نے اپنی نمازوں کا رُخ لنڈن سے آنند بھون اور گاندھی آشرم کی طرف پھیر لیا۔ اربابِ اقتدار کی خوشنودی مزاج کے لئے ہندو مسلم امتیاز مٹا کر ایک متحدہ قومیت کا نظریہ تراشا۔ تاکہ اکثریت نہایت اطمینان و سکون سے پورے ملک پر حکومت کر سکے۔ تمام مذاہب میں عالمگیر سچائی کے وجود کو تسلیم کرایا جانے لگا۔ تاکہ خداوندانِ حکومت یہ کہہ کر انہیں بابِ عالی سے دھتکار نہ دیں کہ تم ہمارے مذہب کو اپنے دین سے کمتر درجہ دے رہے ہو۔ کہیں اہمسا کو ہمسایہ پر فضیلت دے کر جہاد کے اسی دیرینہ ملت کش فتوے کو نئے قالب میں پیش کیا گیا متحدہ قومیت کے راستے میں سب سے بڑا روڑا یہ تھا کہ قرآن کریم مسلمانوں کو کفار کی دوستی سے بڑی شدت سے منع کرتا ہے۔ اس پر انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ قرآن کریم تو صرف اُن کفار کی دوستی سے روکتا ہے جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ و قتال کیا ہو۔ عام کفار کی دوستی سے منع نہیں کرتا۔ لہٰذا انگریز سے دوستی حرام اور ہندو سے حلال ہے۔ (وہ تو اللہ کا احسان ہے کہ اس نے قرآن پاک کے ایک ایک لفظ

پہ پہرے بٹھا رکھے ہیں ورنہ یہ لوگ انہیں اپنی جگہ سے ہلا دیں) ایسے مسلمان اپنی سوسائٹی کو دھوکہ دے کر مسلمان نہیں رہتے۔ علامہ نے اس امتیاز کو واضح طور پر کہدیا ہے کہ:۔

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو ہے آپ ہی تقدیرِ الٰہی

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم تمام نوعِ انسانی کے ساتھ عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے کہ وہ مساواتِ انسانی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ لیکن وہ انسانوں کے مختلف طبقات کے فرق کو بھی نظرانداز نہیں کرتا وہ صاف صاف کہتا ہے کہ ظالم اور مظلوم میں نمایاں فرق ہے۔ اگر تمھیں مظلوم کے ساتھ ہمدردی ہے تو اس کی مدافعت امداد کی خاطر ظالم کی مخالفت کرنی ہوگی۔ تم بیک وقت ظالم اور مظلوم دونوں سے دوستی نہیں رکھ سکتے۔ مظلوم سے دوستی کا لازمی نتیجہ ظالم سے ترکِ دوستی ہے۔ اس لئے کہ ظالم کا دوست بھی ظالم ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

"اور اس طرح ہم ظالمین کو اُن کے اعمال کی ہمرنگی کی وجہ سے ایک دوسرے کا دوست بنا دیتے ہیں" (۶/۱۳۰)

دوسرے مقام پر فرمایا کہ :-

"اور یقیناً ظالمین ایک دوسرے کے دوست ہیں اور
اور اللہ تو متقین کا دوست ہے"۔ ○ (۴۵/۱۹)

اسی اصول وحدت فی الخیال اور عمل کے مطابق قرآن نے تمام نوعِ انسانی کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو دنیا میں احکام الٰہی کے سامنے جھکتی ہے۔ دوسری جو طاغوتی قوتوں کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں۔ دوستی کے لئے فکر و نظر میں یگانگت قلب و دماغ میں ہم رنگی اور خیال و عمل میں وحدت ضروری ہے۔ جہاں ان باتوں میں تضاد پیدا ہوا دوستی ختم اور دشمنی شروع ہوئی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ حکومت کا باغی حکومت کے جاں نثار سپاہی کا دوست ہو۔ نور اور ظلمت۔ خدا اور شیطان کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ مومن کبھی غیر مسلم سے دوستی کے تعلقات پیدا نہیں کر سکتا۔ غیر مسلم خواہ انگریز ہو یا ہندو قرآن کے نزدیک دونوں ایک پلیٹ فارم پر ہیں۔ قرآن نے مومن کا دوست مومن کہا ہے۔

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست
(ولی) ہوتے ہیں اور کفار ایک دوسرے کے دوست"
(۹/۷۱)

علامہ اقبال نے بھی غیر مسلموں سے دوستی کو سخت بُرا کہا ہے اور تاکید کی ہے کہ انھیں اپنا سمجھ کر کبھی ان کے سامنے دامنِ حاجت نہ پھیلا دینا مبادا تمھیں نفرت سے دیکھیں ○

سوالِ مے نہ کروں ساقیِ فرنگ سے میں
کہ یہ طریقۂ رندانِ پاک باز نہیں

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو کفار کی دوستی سے منع کرتے ہوئے ہدایت فرمائی ہے کہ۔

"جو لوگ ایمان والے ہیں انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر کفار سے دوستی کے تعلقات پیدا کریں۔ جس کسی نے ایسا کیا اس کا اللہ کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رہا۔ بلکہ تمھیں چاہیئے کہ ان سے اپنے بچاؤ کا پورا پورا انتظام کرو۔ اور اللہ تمھیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے (کسی اور سے مت ڈرو) اور انجام کار اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے" ۰ (۳/۲۸)

اللہ نے اور بعض مقامات پر کفار کو مومنین کا کھلا ہوا دشمن کہا ہے اور متعدد مقامات پر یہی لفظ شیطان کے لئے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں قانونِ خداوندی سے سرکشی کرنے والے ہیں۔ اس لئے جس طرح کفار ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں شیطان بھی اُن کا ایسا ہی دوست ہوتا ہے۔ اور یہ تمام قوتیں دل کی خرابی کا باعث ہوتی ہیں۔ علامہ نے فرمایا۔

بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب وہ مسلمانوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تم میں سے ہیں یعنی مسلمان ہیں۔ مسلمان ان کے الفاظ پر اعتبار کر لیتے ہیں مگر خدا نے ان لوگوں کو منافق کہا ہے۔

"جب یہ لوگ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں مگر جب وہ اپنے شیاطین کے ساتھ خلوت میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم دل سے تو تمھارے ہی ساتھ ہیں۔ اُن سے (مسلمانوں سے) تو ہم تمسخر کرتے ہیں"۔ ($\frac{۲}{۱۴}$)

قرآن کے انکشاف کے پیش نظر ذرا دیکھئے کہ اپنے ہی اندر کون کون سے ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں اور اپنی ملت سے اس قسم کا تمسخر کرتے ہیں۔ ایسے شخص ضرور ملیں گے جو کفار کے ساتھ خلوت میں بیٹھ کر اُن کی دوستی کا دم بھرتے ہیں اور ظاہرا ہم سے بھی راہ و رسم رکھتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ لوگ اس انداز کو اپنانے کے لئے کیوں مجبور ہو جاتے ہیں؟ ضروریات انھیں مجبور کر دیتی ہیں نفس پرستی انھیں ہانک کر اُدھر لے جاتی ہے اور انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بھیک ان کی ذلت کا باعث ہے۔

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

فتوے دینے والوں نے یہ فتوے تو دے دیا کہ اللہ تعالیٰ صرف اُن کفار کی دوستی سے روکتا ہے جنھوں نے مسلمانوں کا قتال کیا ہو لیکن قرآن کی اس آیت کو نظر انداز کر گئے جس میں ہے کہ:-

"کسی قوم سے دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ
تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے
بہت قریب ہے۔"

اس سے واضح ہو گیا کہ عدل وانصاف کا حکم تمام انسانوں سے ہے خواہ وہ تمھارے بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہوں اور احسان و مروت کی اجازت ان غیر مسلموں سے ہے جو عملاً جنگ میں مصروف نہ ہوں۔ اور دوستی کسی غیر مسلم سے جائز نہیں خواہ وہ شمشیر بکف ہو یا نہ ہو۔

انھیں یہ معلوم نہیں کہ جنگ اور قتل کے اور بھی طریقے ہیں۔ جو فریب کاریوں اور سازشوں کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔ تو کیا ان سازش کرنے والوں کو سینے سے لگا کر رکھنا چاہیے؟ کیونکہ انھوں نے خون تو بہایا نہیں لہٰذا یہ نفرت کے قابل نہیں۔ افسوس کہ یہ لوگ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے پیغام کو کبھی صاف اور کھلے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے کہ یہ کفّار کا لحاظ کرتے ہیں۔

اے لَا اِلٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانہ کردارِ قاہرانہ

حالانکہ قرآنِ کریم نے مسلم کو تعلیم ہی یہی دی کہ وہ اُٹھ کر بے خوف و خطر کہدے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ اور طاغوتی قوتوں میں کود جائے اور اللہ اکبر کی صداقت کے سامنے اُن کے سر جھکا دے۔ آتشِ نمرود میں پروانہ دار چھلانگ لگا دے اور ثابت کر دے کہ یہ آگ خود کسی دوسری قوت کے قبضے میں ہے جس کا نام ربِّ کائنات ہے اور وہ اپنے ماں باپ بہن بھائی اور عزیز و اقارب سے صاف صاف کہہ دے

کہ اللہ ایک ہے سب قوتیں اُس کے ماتحت ہیں اور اگر وہ اس پیغام کو تسلیم نہ کریں تو اُن سے علیحدگی اختیار کرلے پھر اُنہی کے خلاف بغاوت کردے حتےٰ کہ وہ وحدت پر ایمان لے آئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ طاغوتی قوتوں کے ہاتھ میں رزق دیکھ کر جھک جائے اور اُس کی غلامی اختیار کرلے۔ اس جینے سے تو مر جانا بہتر ہے ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مسلمان کا مقام رزق کی وادیوں میں نہیں ہے رزق کے خزانوں کی چابیاں تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ چاہے تو پکے ہوئے خوشوں کے دانے جلا دے رازق تو وہی ہے۔ اس لئے ان چیزوں سے بے نیاز ہو کر خدا کا سپاہی بن جانا ہی آئینِ مسلم ہے۔

آئینِ جواں مردان حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

سپاہی اور اس کا مسلک

اسلام کے نزدیک ہر مسلم بذاتِ خود ایک سپاہی ہے۔ کیونکہ مسلم اور سپاہی کی ایک ہی تعریف ہے۔ یعنی جو اللہ اور اس کے دین کی حفاظت کے لئے اپنا سب کچھ بیچ کر دے۔ اللہ کے یہ سپاہی دو جماعتوں یا گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں ایک وہ جو شمشیر بکف میدان میں نکل جاتے ہیں دوسرے وہ جو میدان سے باہر بے شمشیر طاغوتی قوتوں کو اپنے علم و ہنر سے شکست دیتے ہیں۔ اس گروہ

ہیں صاحبِ شمشیر کے علاوہ سب قسم کے مسلم آجاتے ہیں جن کا نصب العین حفاظت دینِ الٰہی ہوتا ہے۔ انہی مسلموں کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ :-

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اس سپاہیانہ زندگی کی آزمائشوں کے بعد مسلم کو بہت بلند مقام عطا ہوتا ہے جس کی طرف دنیا کی بڑی سے بڑی عزت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے۔ جیساکہ قرآنِ کریم میں ہے۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ($\frac{2}{124}$)

"خدانے فرمایا (اے ابراہیم) میں تجھے انسانوں کے لئے امام بنانے والا ہوں"۔

نوعِ انسانی کی امامت شرفِ انسانیت کی انتہا ہے اور تسلیم و رضا کی ہر کڑی میں ملّتِ حنیفہ کے لئے ہر دور میں امامت و قیادتِ انسانی کے راز سربستہ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ جب دربارِ فرعون میں دوبارہ تشریف لائے تو سینہ میں سوائے ایک اللہ کے کسی کا خوف مضمر نہیں تھا۔ دربار میں پہنچ کر سپاہیانہ شان سے فرعون کو مخاطب کر کے کہا "میں خدا کا فرستادہ ہوں اس لئے حق کے سوا کچھ اور نہ کہوں گا مطالبہ میرا فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کو غلامی پر مجبور نہ کر۔ خدا کے فرستادہ کے حوالے کردے تاکہ وہ انھیں انسانوں کی انسانیت سوز محکومی سے چھڑا کر خدا کی محکومیت میں لائے۔ اور اس طرح انھیں انسانیت کی زندگی سے روشناس کرائے"۔ یہ تھا وہ خدا کا سپاہی جس نے فرعون جیسے صاحب سامان کے سامنے وحدتِ الٰہی کا اعلان کیا اور غلام انسانوں کو واپس مانگا۔ یہ ہے وہ جرأتِ ایمانی جو مسلم سپاہی کو زندہ و تابندہ رکھتی ہے۔

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار
قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالدِ جانباز ہے یا حیدرِ کرار

فرعون سے جنگ کی یہ پہلی داغ بیل بھی جو اس طرح ڈالی گئی۔ جنگ کی اس پہل میں کہیں ذاتی مفاد جھلکتے نظر نہیں آتے۔ کہیں خود غرضیاں تبسم ریز نہیں ہیں۔ نہ یہ رنگ ونسل کی جنگ ہے اور نہ ہی قوم ووطن کی بلکہ جنگ ہے انسانیت کی ظلم کے خلاف۔ جو عین دین ہے۔ لادینی نہیں ہے ؎

لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

مسلم سپاہی ساری کائنات کو قوتِ بازو کی تعلیم دیتا ہے لیکن اسی دنیا میں اس کا مخالف گروہ بھی موجود ہے جسے دوسرے لفظوں میں علماء کی جماعت کہتے ہیں۔ اسی گروہ نے حضرت عیسیٰؑ کی سخت مخالفت کی اور اسی جوشِ مخالفت میں ان حربوں پر اُتر آئے جو فی الحقیقت باعثِ ننگِ انسانیت تھے۔ انجیل میں اس گروہ کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ۔

"اگر یہ بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ یہ ہم پہ بڑی مصیبت ہو گی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا جب ہم اپنی خدمت سے نکال دیے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی

روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔" (نفصل ص۱۴۲)

کسی قوم کی تاریخ پر نگاہ ڈالیئے اس کی غلامی کی زنجیریں پختہ تر کرنے کے لئے ان کے پُرفریب خانقاہ نشینوں اور مسانید علم وارشاد پر برخود غلط تمکن گزینوں کا کس قدر ہاتھ ہوتا ہے؟

خدا کا سپاہی ان کے غلط اصولات زندگی کو نیست و نابود کرنے کے لئے شمشیر بکف نکلتا ہے اُس کا نصب العین ان اصولوں کی جگہ قوانین الٰہی کا نفوذ ہوتا ہے۔ جب وہ حق کی راہ پر تلوار سے کام لیتا ہے تو یہ چلا اُٹھتے ہیں کہ دیکھو یہ کس قدر جابر و ظالم ہے۔ کس قدر سخت گیر ہے۔ کتنا بے رحم اور بے انصاف ہے۔ اور اس کے بعد اس کے دین پر بھی یہی الزام لگایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ دراصل عشق و مستی کا ظہور ہوتا ہے ؎

یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی

اس میں کسے کلام ہے کہ جہاں تک باطنی قوتوں کا تعلق ہے حضرت انبیاءِ کرام شرفِ انسانیت کی معراج پر ہوتے ہیں۔ لیکن وہ انقلاب جو ان کے ہاتھوں سے معرضِ وجود میں آنے والا ہوتا ہے اس کے لئے مادّی قوتوں کی بھی ازبس ضرورت ہوتی ہے۔ گو کیریکٹر کی قوت بڑی قوت ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مادی قوتیں نہایت لازمی ہیں۔ اگر یہ انقلاب محض باطنی قوتوں کی بنا پر پیدا ہو سکتا تو حضرت انبیاءِ کرام اور ان کی مقدس جماعتوں کو صاحبِ دست و بازو ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اگر یہ باطنی قوت ہی نجات کا موجب ہوتی تو آج

سوائے رہبانیت کے کچھ نظر نہ آتا لیکن یہ نظریہ فیل ہو چکا ہے۔ زمانے نے اسے نقش غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا ہے اور قرآن کی حقیقت کو اپنی زبان سے پکار پکار کر دہرایا ہے کہ زمین پر قانون بغیر قوت کے نافذ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مادی قوتیں تنہا درست نہیں ہیں کیونکہ نری مادی قوتیں تو چنگیزیت اختیار کر جاتی ہیں اس لئے قرآن کی تعلیم کی رو سے تقویٰ اور مادی قوتوں کی معاونت سے ہی نظام کائنات درست رہ سکتا ہے۔ ہمارا یہ انداز کہ سپاہی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ صاحبِ قرآن بھی ہو سراسر غلط ہے۔ ہم نے دین کا نظام مولوی کو سونپ دیا اور اُسے ٹھیکہ پر حاصل کر لیا ہے یہ نظام قطعی غلط ہے۔ خود ہر سپاہی کو امامت کے فرائض انجام دینے چاہئیں کیونکہ جب وہ صاحبِ تقویٰ ہو کر صاحبِ شمشیر ہو گا تو نظامِ الٰہی کی صحیح طور پر حفاظت کر سکے گا۔ کیونکہ یہ امام قوت والا ہے۔

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوّتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد

ہمارا یہ سپاہی بیک وقت دنیا کی ضرورت بھی انجام دیتا رہے گا اور دین کی بھی۔ اور پھر لطف یہ کہ ٹھیکہ کے مولوی کی طرح یہ اجر سے بے نیاز ہو گا۔ یہ سپاہی اپنی اذانوں کا معاوضہ طلب نہیں کرے گا۔ اپنی امامت کی قیمت نہیں گنوائے گا۔ یہ اتباع کرے گا اپنے رسولؐ کا جس کے متعلق خدا نے فرمایا کہ۔

"اے پیغمبر اسلام۔ تم کہہ دو کہ میں اپنی اس خدمت پر اس کے سوا اور کوئی اجر نہیں مانگتا کہ تم میں سے جو چاہے وہ اپنے پروردگار تک پہنچنے کے لئے راستہ بنا لے۔" (۲۵/۵۷)

پھر جب یہ اجر سے بے نیاز امام اللہ اکبر کی صدا سے دنیا کو توحید کی دعوت دے گا تو یہ آواز دل سے نکل کر دل میں جگہ پیدا کرے گی کیونکہ اس کا مقام اور کہیں نہیں ہوتا ؎

اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی
ہو جاتی ہے خاکِ چمنستاں شررِ آمیز
اس مردِ خود آگاہ و خدامست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

مسلم کا مقام اس قدر بلند ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ اسے سمجھ ہی نہیں سکا۔ اور نہ ہی اسے ہمارا یہ مولوی سمجھتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا اور چھری ہاتھ میں لے کر اللہ کی رضا کے لئے ہاتھ اُٹھایا۔ زمین کانپ اُٹھی آسمان ششدر تھا کہ یہ کیا تماشا ہے۔ فرشتے انگشت بدنداں تھے کہ یہ کیا حرکت ہے کہ انسان انسان کا خون بہا رہا ہے۔ لیکن ہمراز کہہ رہا تھا۔ کہ ؎

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ نے اس قربانی کے لئے حکم نہیں فرمایا تھا وہ محض خواب کو مجاز پر محمول فرما کر بیٹےؑ کی جسمانی قربانی کے لئے آمادہ ہو گئے مشیّتِ ایزدی نے بھی عاشقوں کی طرح آخری منزل تک اُنھیں اسی دُھن میں چلنے دیا کہ دُنیا کو معلوم ہو جائے جسے نوعِ انسانی کے لئے بطور امام منتخب کیا جا رہا تھا وہ کن خصوصیات کا پیکر تھا۔ اور یہ سپاہی محض زبان سے لَا اِلٰہَ نہیں کہتا بلکہ

اس کا عمل بھی وہی ہے جو اس کا ذکر ہے ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

دنیا نے حضرت ابراہیمؑ کو قہار و جبار کہا اور کافروں نے پراپیگنڈا کیا کہ جس شخص کا مسلک اپنی اولاد پر سختی کروا سکتا ہے وہ دوسروں کو کب چھوڑیگا لہٰذا اس کا خدا اور یہ دونوں (نعوذ باللہ) ظالم ہیں۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ یہ سپاہی اپنوں میں ریشم بھی بن جاتا ہے۔ یہ فولاد ہوتا ہے کفر کے مقابلہ میں۔ قہار و جبّار ہوتا ہے ظالموں کے لئے اور مظلوموں کے لئے رحمت ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

لیکن آج مسلمان نے وہ سپاہیانہ لباس بدن سے اُتار پھینکا ہے۔ اپنے اندر سے وہ شرافت و انسانیت ختم کر دی ہے۔ ذہنی تصورات اور قلبی کیفیات کے بدل جانے سے باہر کی پوری دنیا بدل جاتی ہے۔ اس لئے جسے خدا کا عذاب کہا جاتا ہے وہ کہیں باہر سے نازل نہیں ہوتا۔ انہی داخلی کیفیات و تصورات کے بدل جانے سے صلاحیت اور اہلیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک قوم اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور زمانہ اُسے ہلاک کر دے۔

"یہ نہیں ہو سکتا کہ تمھارا پروردگار آبادیوں کو ناحق ہلاک کر دے جن کے باشندے صالح ہوں" ۱۱/۱۲

اس ہلاکت کے خطرہ کے احساس سے علامہ نے مسلم سپاہی کو متنبہ کیا ہے ؎

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

یہ ہلاکت اُس وقت ہوتی ہے جب کوئی قوم سلامتی کی راہ قانونِ فطرت کو چھوڑ کر غیر فطری راہیں اختیار کر لیتی ہے۔

"اور ہر گز ایسا نہیں ہوتا کہ اللہ ان پر ظلم کرتا ہے مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔" (۹/۵ - ۲۹/۴۵)

ہلاکت اور تباہی ہمیشہ اپنے کاموں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر قومِ نوح غرق ہوئی تھی تو اپنی ہی خطاؤں کے باعث۔ اگر قومِ ثمود تباہ ہوئی تھی تو اپنے ہی جرائم کی وجہ سے۔ اور اس کے برعکس جب قوم کے افراد نیکی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اللہ کی راہوں پر گامزن ہوتے ہیں اور اللہ کے قوانین کو زمین پر نافذ کرنے کے لئے سر بلند کرتے ہیں تو اُن کے نعرۂ حق و صداقت سے پہاڑ دہل جاتے ہیں۔ وہ آگ جس کا خاصہ جلا دینا ہے جب اس کی لپیٹ میں کوئی ابراہیمؑ کود پڑتا ہے تو یہ اپنی فطرت بدلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ پانی جس کا خاصہ بہا لے جانے کا ہے جب کوئی کاروانِ موسیٰ اس کے اندر قدم رکھتا ہے تو اپنی طغیانیاں سکیڑ لیتا ہے ؎

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

پینتیس برس کی سعی و کاوش اور جدّ و جہد کے بعد ۱۰ھ میں حضورؐ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ اس خبر کا عام ہونا تھا کہ سارا عرب ہمرکابی کے لئے اُمڈ آیا۔ ذیقعدہ کی ۲۶ تاریخ حضور مدینۂ منورہ سے جانب کعبہ روانہ ہوئے۔ مدینہ سے باہر چھ میل کے فاصلہ پر قیام فرمایا۔ دوسری صبح حضور نے احرام باندھا۔ اور بلند آواز سے فرمایا کہ۔

"ہم حاضر ہیں اے خدائے بزرگ و برتر۔ تیرے بندے تیرے حضور میں حاضر ہیں۔ حمد و ستائش کی مرکز تیری ہی ذات ہے اس میں کوئی اور شریک نہیں۔ حکومت صرف تیرے لئے ہے۔ اس میں کسی اور کا حصہ نہیں ہے۔"

اس آواز سے دشت و جبل گونج اُٹھے۔ یہ کاروانِ عشق و ذوق تمام دامنِ صحرا پر ریت کے چمکتے ہوئے ذروں کی طرح تا بحدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جمیل و جلیل تو بھی جلیل و جمیل

خدا کے سپاہیوں کا یہ قافلہ تقدس کی زمزمہ باریوں سے منزل بمنزل آگے بڑھتا گیا۔ ان سپاہیوں کے سینوں میں تڑپتے ہوئے دل۔ ان اماموں کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی فراست۔ ان رہنماؤں کی پیشانیوں میں مچلتے ہوئے سجدے۔ ذوق عبودیت کی متاعِ گراں بہا در آغوش۔ جن عمل کی کامرانیوں اور سعی پیہم کی شادکامیوں کی ایک جنت اپنے دامن میں لئے یہ راگ الاپتے بڑھتے چلے گئے۔

شوق میری لے میں ہے شوق میری نے میں ہے ۔۔۔ نغمہ اللہ ھو میرے رگ و پے میں ہے

یہ عصارہِ روزگار جماعت یہ لشکرِ خدامست۔ یہ عسکرِ خود آگاہ۔ یہ حریت و مساوات کے علم بردار۔ یہ احترام انسانیت کے پیغام

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

حضور کے ساتھی سپاہیوں نے جھوم جھوم کر اللہ کا شکر ادا کیا اور وجد میں آ کر کسی سپاہی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

ساقیِ اربابِ ذوق فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اسکی اصیل

جب کعبہ پر نگاہ پڑی تو حضورؐ نے مسرت کے والہانہ انداز میں فرمایا کہ خدا کے سوا کوئی حاکم و آقا نہیں، فرشتوں نے جب ان سپاہیوں کو ہجومِ مسرت میں دیکھا تو کہا۔

مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لَاالٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پناہ لَاالٰہ

اللہ کے یہ سپاہی صرف اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔ دنیا کی کوئی دوسری طاقت انہیں نہیں جھکا سکتی۔ اقبالؒ نے اس سپاہی کے متعلق فرمایا ہے ؎

اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

ماضی کے آئینے میں سپاہی کو اس کی جھلک دکھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اُندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اور پھر دورِ حاضرہ کے سپاہی کے دل کی حرکتوں پہ ہاتھ رکھ کر کلیمِ ملت فرماتے ہیں۔

دیدہ انجم میں ہے تیری زمین آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کونسی وادی میں ہے اور کونسی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلہ سخت جاں

علامہ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ عدم کی نگاہ ہمارے اِس دور پر بھی تھی یعنی حصول پاکستان کے بعد ہماری بدلتی ہوئی زندگیوں کے رخ سے غافل نہیں تھے آپ کا یہ شعر صداقتِ بیان کے لئے کافی ہے۔

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا؟
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا؟

اذان اور امام

اسلام کی سب سے پہلی امامت بانی اسلام سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفٰےا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں تھی جس طرح دنیا کا آخری اور عالمگیر دین دین اسلام ہے اسی طرح دنیا کے سب سے بڑے امام سید الانبیا۔ خیر البشر رسول اللہ ہیں۔ آپ بیک وقت بہترین سپاہی بھی ہیں اور عمدہ امامِ اعظم بھی۔ ایک ہی میدان میں فوجی لباس سے آراستہ ہو کہ جہاں آپ نے سپاہیانہ فرائض انجام دئے۔ اور دنیا نے فخر محسوس کیا کہ ہمارا امام اللہ کا وہ سپاہی ہے جو اللہ کا رسول ہے۔ یہی عشق کی چنگاری حضرت بلال رضؓ کے خرمن عشق میں موجود تھی کہ سینے میں وہ سوز تھا کہ اللہ اکبر کی صدا سے فضا کانپ اٹھتی تھی۔ ان اماموں کی کمر میں تلوار لٹکی رہتی تھی۔ ان اماموں نے کسی مسجد کو مقام حیات نہیں بتایا اور مسجد کی آمدنی کو ذریعہ معاش نہیں ٹھہرایا بلکہ ایسا نااہل کمزور اور بزدل شخص اسلام کا سپاہی بن ہی نہیں سکتا اور جو اسلام کا سپاہی نہیں وہ مسلمان نہیں ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اس دور میں مسجدوں کے مولوی صاحبان صرف مسجد کی روٹیوں پر جیتے ہیں نہ ان میں قوتِ بازو کی جھلک ہے نہ محنتِ شاقہ کا ذوق ہے۔ یہ اس قدر تن آسان ہیں کہ ان کے لئے روٹی بھی یہیں پہنچا دی جاتی ہے۔ یہ روٹی دینے والے خیرات صدقہ یا بھیک دیتے ہیں۔ کیا مسلمان پر یہ تن آسانی حرام نہیں ہے؟ کیا وہ امام جو قوم کو صرف اللہ کے خوف سے نہ ڈرائے اور جہاد کے لئے ہر وقت تیار نہ رکھے اور خود بھی نہ رہے امامت کے قابل ہے!

؟ کیا وہ اس کے لائق ہے کہ مُردوں کی طرح اس کی امداد کی جائے؟

کیا یہ فرد قوم کے جسم پر ناسور نہیں ہے؟ کیا ہمیں جائز ہے کہ ایسے تن آسان آدمی کے پیچھے نماز ادا کریں اور اللہ کی عبادت انجام دیں؟ یہ مولوی جو اس حقیقت سے واقعی ناواقف ہے کہ

واقف ہو اگر لذتِ بیداری شب سے
اُونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پُر اسرار

کیا اس مولوی کو وہ زمانہ یاد نہیں ہے کہ جب حضور خود حضرت بلال رض سے اذان کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ وہ کونسی چیز تھی جو حضور کو بھی مجبور کر دیتی تھی کہ وہ بلال رض کی آواز سُنیں۔

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار

کیا اس وقت بھی ایسا ہی ہوتا تھا کہ اذان بلند ہوتی ہو اور مسلمان اس کے قریب سے گذر گئے ہوں اس طرح پہلوتہی کا ثبوت دیا ہو جیسے کچھ سُنا ہی

نہیں - یا اس انداز سے آنکھ چرا کر گذر گئے ہوں جیسے بلانے والے سے کوئی راہ ورسم ہی نہیں ہے اور مسجد کی مختصر سی منزل کو یوں تیزی سے کاٹ دیا ہو جیسے تلووں میں کانٹے چبھ رہے ہوں - اگر نہیں تو ماننا پڑے گا کہ وہ اذان نہیں تھی اللہ کے سچے بندوں کے سچے دلوں سے نکلی ہوئی آواز تھی بلکہ خدا کی آواز کا ترجمہ تھا جسے وہ خود بھی کہتے تھے اور سنانے والوں نے خوب سمجھ کر کہا تھا - اور سننے والے اس آواز پر ایمان رکھتے تھے کہ اسی وقت دنیا کو چھوڑ کر اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچ جائے اور اس کی نعمتوں کا شکرانہ ادا کر کے آئے - یہ اذان در حقیقت خدا کا پیغام ہے -

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

آپ کہیں گے کہ اگر یہ اذان اللہ کا بلاوا ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں تو پھر ہمارے قدم اس کی طرف کیوں نہیں اٹھتے ؟ آپ کا خیال درست ہے - بات یہ ہے کہ ہمارا موذن صاحبِ ایمان نہیں ہے - وہ بلاتا نہیں ہے بلکہ نوکری پوری کرتا ہے ورنہ محلہ والے اس کی روٹی بند کر دیں - یہ روٹی کا مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ انسان اس کی طاقتوں کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتا ہے - اسی لئے اللہ نے فرما دیا ہے کہ ——— اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے -

اگر یہی مولوی اپنی روٹی اپنے زورِ بازو اور محنتِ شاقہ سے کما کر حلال کی روزی کھائے تو یقیناً اس کے اندر وہ تمام جوہر آجائیں جس کا دوسرا نام خودی ہے -

جب یہ محتاج نہ رہے گا یہ خدا کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہیں کرے گا۔ یہی بیباکی مومن کا نشان ہے اور مسلم کی پہچان ہے لیکن ہمارا مسجد کا ملاّ جس کی ساری زندگی قرآن کی تاویلوں میں گزر جاتی ہے جو محض اپنے اس ذریعہ معاش کو بدستور قائم رکھنے کے لئے غلط دین کی تبلیغ سے بھی گریز نہیں کرتا اپنی شرافت اور اپنے معراج انسانیت سے بے خبر رہتا ہے۔ اور یہی بے خبری ذلت ہے۔ اور یہ انفرادی ذلت پوری کی پوری قوم کی ذلت بن جایا کرتی ہے۔ جس قوم کے امام ذلیل ہوں گے۔ وہ قوم کیونکر صاحب عزت ہو سکتی ہے اور کیسے اللہ کے انعامات کی مستحق ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی حالت میں ہمارے امام ہیں۔ جس کے متعلق اقبال نے فرمایا ہے کہ:۔

عجب نہیں کہ خدا تک تیری رسائی ہو
تیری نگاہ سے پوشیدہ آدمی کا مقام
تیری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تیری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

ہمارے مولوی انگریز کے زمانہ میں بھی یہ ہوا کہ ان علماء نے ان کی غلامی کو از روئے قرآن جائز کیا اور پھر ہندو کی غلامی کے طوق کو بھی مناسب فرمایا۔ اور قرآن کی آیاتِ کریم کو اس انداز سے اُلجھایا کہ عوام اُلجھ کر رہ گئے۔ اقبال نے ان کے متعلق کہا۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

دوسری جگہ ان اماموں کو مخاطب کیا ہے۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اپنے ماضی کے امام کی تصویر دیکھ کر فرمایا کہ

میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام

اور ان مفتیانِ زمانہ کو تعلیم دی :۔

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم

جب علماء نے ہندو کے خلاف جہاد کو خلافِ اسلام قرار دیا تو علامہ نے کہا

فتوےٰ ہے شیخ کا کہ یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

اس مولوی طبقہ نے اپنے خداوندوں کو خوش کرنے کے لئے جہاد کو اس طرح غلط لباس پہنا کر پیش کیا کہ ہمارا نوجوان طبقہ اس تقریر سے باغی ہو گیا۔

تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں
ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر

مولوی صرف مسجد کی چار دیواری میں گھر کر رہ گیا اس نے تمام متاعِ حیات فرنگی کے ہاتھ فروخت کر دی :۔

خریلی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی　　مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود

اس متاعِ دین وملت کو بیچنے کے بعد مولوی حجرے میں بیٹھ گیا اور خلوت نشین ہو کر اللہ ھو کرنے لگا۔

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تیری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مولوی کے اندروں سے سوز و سازِ حیات ختم ہو گیا ایک ڈھانچہ رہ گیا۔ جس کی غذا اناج کے سوا کچھ نہ رہ گئی۔

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اور سمجھایا کہ ان بتوں کے حضور سے سر اٹھا کر اور صرف اللہ کے آستانے پر جھک جا کہ نجات کا مقام وہی ہے

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اقبال نے ایک ایک مسجد کے مولوی کو پرکھ کر دیکھ لیا اُسے کہیں اور کسی دل میں ایمان کی جھلک نظر نہ آئی

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

اپنے دور کے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ یہ امام تیرا امام نہیں

ہے نہ یہ امامت کے اہل ہے۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

پھر ان فقیہانِ دورِ حاضرہ کی منت کرتے ہیں:۔

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ!
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا!
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

لیکن اِن اماموں پہ اقبال کا کچھ اثر نہ ہوا اقبال نے یہ اندازِ شکایت کہا۔

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

کبھی اللہ کی غیرت کو ضرب لگانے کی سعی فرمائی ہے۔

ہے میری بانگِ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ
کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود؟

جب ان مولویوں کی یہ سردمہری دیکھی کہ ان میں غیرتِ قومی کا شائبہ تک نہیں تو فرمایا۔

فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق
پیدا ہو اگر اسکی طبیعت میں حریری

خوددار نہ ہو فقر تو ہے قہر الٰہی
ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہیدِ امیری

اور پھر اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ

اِسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تیری
ترے بدن میں اگر سوزِ لا اِلٰہ نہیں

بجائے اس کے کہ یہ طبقہ اسی مردِ قلندر کی دولت سے مالامال ہو کر قوم کو افلاس کی تباہی سے بچا لیتا اُلٹا اقبال پر کفر کے فتوے دینے لگا۔ اس پر اقبال نے کہا۔

کیا صوفی و مُلا کو خبر میرے جنوں کی
انکا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

اقبال نے کہا ہے کہ یہ فریضہ تمہارا تھا تم عالم تھے صاحبِ قرآن تھے میں مغرب زدہ تھا تمہیں لازم تھا کہ نوجوانوں میں تعلیم الٰہی عام کرتے مگر:۔

نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے کلیم تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

اور آخر میں فرمایا:۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تیری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

پاسبانِ ملت

تاریخ کے اوراق کو ساڑھے تین ہزار سال آگے الٹئے اور قوم بنی اسرائیل سے ہندی مسلمانوں تک آپہنچیے۔ آپ دیکھیں گے کہ انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت بعینہٖ وہی ہو چکی تھی جس کا نقشہ قرآن کریم نے داستانِ بنی اسرائیل کی شکل میں کھینچا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شجرِ ملت کی ہر شاخ پر افسردگی اور پژمردگی چھا چکی تھی۔ مدت ہائے دراز کی غلامی اور محکومی سے ان کے حوصلے پست، ہمتیں کمزور، افکار جامد، اعمال خامد، ارادے سقیم اور تمنائیں عقیم ہو چکی تھیں۔ ہر شعبۂ زندگی، بساطِ بے نظام اور ہر فردِ کارواں، ناقۂ بے زمام تھا، دماغ فکر سے عاری۔ دل، سوز سے خالی۔ نگاہیں بے نور، قلوب بے حضور۔ قوم کیا ایک راکھ کا ڈھیر تھی جسے مخالف ہوائیں جدھر جی چاہے اڑائے اڑائے پھر رہی تھیں یہ تھا وہ جس میں مبدءِ فیض کی کرم گستری نے اقبال جیسا مردِ خود آگاہ خدامست اس قوم کو عطا کر دیا جس نے اپنی نفس گدازیوں سے اس مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک کر ان میں حیاتِ نو کے آثار پیدا کر دیئے اور اپنی شعلہ نوائیوں سے راکھ کے اس ڈھیر میں پھر سے زندگی کی چنگاریاں نمودار کر دیں۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی تو اسے بالعموم وہی بڑے بوڑھے دکھائی دیئے جن میں تبدیلیِ احوال کی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس لئے اسے سوچنا پڑا کہ وہ اپنے اس پیغام کو جس کا ایک ایک لفظ حشر بداماں اور ایک ایک حرف برق ساماں تھا۔ کس کے سامنے پیش کرے۔ لیکن اسے اس فیصلہ میں کچھ دقت نہ ہوتی۔ اس لئے کہ تاریخ کے اوراق، فلسفہ کے غوامض، فطرتِ انسانی کے مشاہدات اور قرآن کریم کے حقائق

و معارف نے یہ حقیقت اس پر بے نقاب کر دی تھی کہ قوم کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھوں میں ہوا کرتی ہے۔ ان کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے خون گرم کی حرارتیں، ان کا زورِ بازو، ان کا جوشِ کردار ایک کف بداماں سیلاب کی طرح اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے وہ جانتے تھے کہ قوموں کی تخلیق نو، ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہین منت ہوتی ہے۔

اس لئے یہی وہ طبقہ تھا جسے انھوں نے اپنے تصورات کی آماجگاہ، اپنی امیدوں کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی لئے اپنے پیغاماتِ انقلاب آفریں کا درخورِ تخاطب سمجھا۔ انہی کے لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ

جوانوں کو مری آہ سحر دے ۔۔۔ پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے ۔۔۔ مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور انہی کو اپنے سوز و گداز، تپش و خلش، تڑپ اور اضطراب کا وارث سمجھتے تھے۔ بالِ جبریل کے ساقی نامہ میں دیکھئے۔ جذب و کیف کی کس والہانہ بے تابی سے بحضور رب العزت ملتجی ہوتے ہیں کہ

تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر ۔۔۔ زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے ۔۔۔ مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں ۔۔۔ مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
امنگیں مری، آرزوئیں مری! ۔۔۔ امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر ۔۔۔ اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے - ٹھکانے لگا دے اسے

ان کی آرزو ہی یہ تھی کہ جس پیغامِ انقلاب انگیز کو وہ قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ نونہالانِ ملت کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے تاکہ وہ وہاں سے زندہ آرزوں کا چشمہ بن کر اُبلے اور خیابانِ ملت کو اس طرح سیراب کر دے کہ اس کی ایک ایک شاخ پھر سے شگفتہ و شاداب نظر آنے لگ جائے اسی لئے وہ دعائیں مانگتے تھے۔

تاریخی آثار و شواہد جوان کے نور بصیرت سے ان کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جاتے تھے، اس حقیقت کبریٰ کو واضح کئے دیتے تھے کہ

گرچہ اس دیر کہن کا ہے یہ دستور قدیم
کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمت بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا
انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخاب حیات

لیکن ان کے ہاں محض شاعرانہ جذبات نگاری نہ تھی بلکہ ان کی نگاہِ حکمت و بصیرت زندگی کے حقائق کو پرکھتی اور ہر شے کو اس کے حقیقی مقام پر دیکھتی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ صدیوں کی غلامی سے قوم ہلاکت و تباہی کے جس جذام میں گرفتار ہے۔ قوم کے نوجوان بھی اس کے مہلک جراثیم سے محفوظ نہیں ہیں۔ جوانی کے پیمانے دن اور سال نہیں بلکہ کشمکشِ حیات میں عزم و استقامت سے سینہ سپر ہونے کی ہمت ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس معیار کے مطابق قوم کے

کے تنو مند جوان بھی پیرانِ کہن سال سے کچھ بہتر نہیں ہیں اس لئے وہ ان کی عافیت کوشی اور سہل انگاری پر خون کے آنسو روتے تھے۔ وہ ان نرم و نازک پیکرانِ آب و گل کی طرف نہایت حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتے اور سردِ آہ بھر کر کہتے کہ

تیرے سوفے ہیں افرنگی تیرے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

یہی کج کلاہانِ ملتِ قوم کے مستقبل کے آئینہ دار تھے لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے قلوب دولتِ یقین سے تہی مایہ، ان کی نگاہیں نورِ بصیرت سے محروم ان کے بازو قوتِ عمل سے بیگانہ اور ان کے دماغ تخلیقِ مقاصد کی متاعِ گراں مایہ سے عاری تھے۔

ان کی زندگی بے مقصد ان کے افکار پریشان، نہ کوئی متعین نصب العین نہ منتہائے نگاہ، کبھی جذبات کی ان وادیوں میں مصروف جادہ پیمائی، کبھی امیال و عواطف کے ان صحراؤں میں مشغولِ انجمن آرائی۔ زندگی کے حقائق سے چشم پوشی اور مصارفِ حیات سے گریز پائی۔

لیکن ان کی یہ تادیب، ایک طبیب مشفق کی تشخیص تھی، فیصلہ عدالت کی تہدید نہیں تھی۔ ان کا ناوک تنقید، ایک جراحِ غم خوار کی نوک نشتر تھی۔ فریقِ متخاصم کی سنانِ زہر آلود نہ تھی۔ ان کی تنبیہ ملا کی نفرت انگیز لاحول نہ تھی، مادرِ مہربان کی ہیلی تھی کہ جس کی چوٹ بچے سے پہلے خود اپنے کلیجے پر پڑے۔ یہ قہر آلودہ نگاہیں

غصہ سے لال پیلی نہیں ہو رہی تھیں بلکہ دل کا خون تھا جو شدت غم سے آنکھوں
کھینچ آیا تھا۔ وہ انہیں دیکھتے تھے تو راتوں کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتے
اور سسکیاں لے لے کر کہتے تھے کہ

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

لیکن انھوں نے اس لٹی ہوئی متاع کی فقط مرثیہ خوانی نہیں کی بلکہ یہ بھی بتا
کہ یہ لٹی کیسے! جب تک یہ نہ بتا دیا جاتا اس کے تحفظ و بقار کا انتظام کیسے کیا
جاسکتا تھا؟

تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالئے۔ ایک مسلسل داستانِ صید و صیاد نظر آئے
ہر وہ شخص یا اشخاص کی جماعت جو کسی طرح قوت فراہم کرلیتی ہے۔ کمزور انسانوں
اپنی ہوسِ کام جوئی کا ذریعہ بناتی ہے۔ مختلف زمانوں میں اس قوت کے استعما
کے اسباب و ذرائع بدلتے رہے ہیں، روح ہمیشہ اور ہر جگہ وہی کارفرما رہی
ہے۔ عہدِ جاہلیت میں چونکہ انسان کی عقلِ حیلہ جو نے ابھی ایسی پرکاری نہیں
سیکھی تھی۔ اس لئے اس زمانہ کے اوزاروں اور ہتھیاروں کی طرح، محکوموں
پنجہ استبداد میں جکڑے رکھنے کے حربے بھی کھردرے اور کند ہوتے تھے
جنھیں ہر آنکھ مشہود اور ہر قلب محسوس کرسکتا تھا۔ لیکن جوں جوں انسانی عقل
مکر و حیل کی وضع و ساخت میں ترقی کرتی گئی، آلات و ادواتِ حرب و ضرب
طرح، مغلوب قوموں کو ضعیفی و زبردستی کی نیند میں سلائے رکھنے کے اسباب

ذرائع بھی لطیف وغیر محسوس ہوتے چلے گئے ان تمام ذرائع میں، تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں، ان کے بچوں کو اسی قسم (کی) تعلیم دیتے جائیے۔ بلا مزید سعی و کاوش، وہ قوم خود بخود آپ کے ذہنی سانچوں (می)ں ڈھلتی جائے گی۔ اور یہ تبدیلی کچھ اس طرح غیر مرئی طور پر ظہور پذیر ہو جائے (گ)ی کہ اس قوم کو پتہ تک بھی نہ چلے گا کہ ہم میں کوئی تبدیلی پیدا کی جا رہی ہے۔
(ج)ب ہندوستان میں انگریز آیا ہے تو اس نے محسوس کر لیا کہ مسلمان ہی وہ قوم (ہ)ے جو اس کے تغلب و استبداد کے راستہ میں روڑا بن سکتی ہے۔ چنانچہ (ا)س نے اس قوم کو اپنے مطلب کے مطابق بنانے کے لئے وہی غیر محسوس لیکن (ب)ہدف نسخہ استعمال کیا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس نے اس قوم (کا) نظام تعلیم بدل دیا اور اس ایک تبدیلی سے تھوڑے سے عرصہ میں پوری (کی) پوری قوم بدل گئی۔

یہ تھی وہ قومِ غالب کی سحر آفرینی جو قومِ مسلم کی تبدیلئ احوال (بلکہ تبدیلئ فطرت) (کی) موجب بنی تھی اور اس کی پردہ کشائی اس مردِ مومن کے پیشِ نظر تھی۔ اس باب (می)ں وہ فرماتے ہیں۔

اک مردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے
منظر وہ طلب کر کہ تیری آنکھ نہ ہو سیر
بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم
بّرے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر ... (سین)ے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

وہ جب ان مدعیانِ علم و ہنر کو دیکھتا کہ ان جھوٹے نگوں کی مینا کاری نے ان کی نگاہوں میں کس قدر خیرگی پیدا کر رکھی ہے تو وہ ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ کہ جو درحقیقت اس کا خندۂ زخم پنہاں ہوتا تھا، ان سے کہتا کہ فریبِ باطل پر یہ نازو فخر کس لئے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ

ترا وجود سراپا تجلّیٔ افرنگ
کہ تو وہاں کی عمارت گری کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

(ادبی پریس رابسن روڈ کراچی)